www.urduchannel.in

حالی کی سوانح نگاری

حیاتِ جاوید کی روشنی میں

ملک راشد فیصل

اردو چینل
www.urduchannel.in

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

www.urduchannel.in

حالی کی سوانح نگاری

حیات جاوید کی روشنی میں

ملک راشد فیصل

IHSAN UL HAQ (Bs urdu)

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۶

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

© رشیدہ واحدی

HALI KI SAWANEH NIGARI
HAYAT-E-JAVED KI ROUSHNI MEIN

by

Malik Rashid Faisal

Year of 1st Edition 2007

ISBN 81-8223-253-8

Price :Rs 100/-

نام کتاب حالی کی سوانح نگاری — حیات جاوید کی روشنی میں

مصنف ملک راشد فیصل

پتہ K-101 فلیٹ نمبر 11، ابوالفضل انکلیو پارٹ ون، جامعہ، اوکھلا، نئی دہلی۔ ۲۵

سن اشاعت ۲۰۰۷ء

قیمت ۱۰۰ روپے

مطبع عفیف آفسیٹ پرنٹرس، دہلی

Published by

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE

3108,Vakil Street, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6(India)

Ph : 23216162, 23214465, Fax : 0091-011-23211540

E-mail: ephdelhi@yahoo.com

IHSAN UL HAQ (Bs.urdu)

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

انتساب

امّی

اور

ابّو

کی بے لوث محبتوں اور قربانیوں

کے نام

★★

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

فہرست

- پیش لفظ — ملک راشد فیصل — ۷
- باب اوّل
  سوانح نگاری اور اس کا فن — ۱۱
- باب دوم
  سوانح نگاری کا ارتقاء — حالی کے عہد تک — ۳۳
- باب سوم
  حالی کی سوانح نگاری کا تنقیدی مطالعہ
  حیات جاوید کی روشنی میں — ۵۹
- باب چہارم — ۱۰۲
  خلاصہ — ۱۱۰
  کتابیات

★★

IHSAN UL HAQ (Bs urdu)

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

حالیؔ ز نواہائے جگر سوز نیا سود
تالالۂ شبنم زدہ را داغ جگر داد

اقبالؔ

★★

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

پیش لفظ

الطاف حسین حالی کی حیثیت اردو ادب میں ایک مجدد کی ہے جنھوں نے نہ صرف اُردو شاعری اور اردو تنقید کو جدید تقاضوں سے آشنا اور سیراب کیا بلکہ اردو سوانح نگاری کو بھی اپنے قلم سے وہ توانائی دی جس سے اس کا باقاعدہ شعوری طور پر آغاز ہو سکا۔ 'مسدس حالی' اور 'مقدمہ شعر و شاعری' کے نام و اہمیت سے تو اردو کا ایک نوخیز طالب علم بھی واقف ہوتا ہے۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ بیسویں صدی میں ان کے بغیر شاعری اور خصوصاً تنقید میں ایک قدم بھی چلنا دشوار ہے۔ اردو تنقید کی پوری عمارت حالی کی تنقید پر قائم ہے جسے الگ کر دینے سے پوری عمارت زمین بوس ہو جائے گی۔ ''مسدس حالی'' کی اہمیت و عظمت سرسید جیسے مصلح قوم کے اس قول سے وابستہ کی جاتی ہے کہ یہی آخرت میں میری نجات کا ذریعہ بنے گی۔ غرض یہ کہ ادبی نقادوں نے حالی کی شاعری و تنقید کے ضمن میں صفحات کے صفحات سیاہ کر دیئے ہیں۔ مگر ان کی سوانح نگاری کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی۔ حالانکہ ان کی سوانح نگاری کے حسن کو شبلی جیسے معترض بھی تسلیم کرتے ہیں۔ اُردو میں سوانح نگاری کے فن کے لیے ادبا و ناقدین نے جو معیارات مرتب کیے ہیں اُن کی پاسداری سوانح نگار کا فرض اوّلین ہے۔ حالی نے جب اس مشکل اور پیچیدہ وادی میں قدم رکھا اُس وقت ان کے سامنے فن سوانح نگاری کے اصول و قوانین واضح نہیں تھے۔ اس کے باوجود انہوں نے اپنی ذاتی صلاحیت اور کوششوں سے اُردو میں سوانح نگاری کی باقاعدہ بنیاد ڈالی اور بالواسطہ اس کے اصول مرتب کیے۔ اس ضمن میں حالی کی کاوشوں کو قارئین کے سامنے پیش کرنے

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

کی جسارت کر رہا ہوں۔

میں نے اس کتاب میں حتی المقدور کوشش کی ہے کہ حیات جاوید سے متعلق حالی کی فنی وضاحت کے اصل حقائق کو سامنے لاؤں تا کہ راہ پا گئی غلط فہمیوں اور اعتراضات کا ازالہ کیا جا سکے۔ لیکن محض اسی پر اکتفا نہیں کیا گیا ہے بلکہ زیر تنقید کتاب میں واقعی جو فنی خامیاں ہیں ان پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ظاہر ہے ادب میں کوئی بھی تصنیف یا تالیف حرف آخر نہیں ہوتی۔ بشریت کا تقاضا ہے کہ غلطیاں سرزد ہوں لہٰذا انھیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ حالی کی سوانح نگاری کو بھی فنی خامیوں سے یکسر بری قرار نہیں دیا جا سکتا۔ چنانچہ اس کتاب میں ان کی طرف بھی نشان دہی کی گئی ہے۔

اردو ادب کی ابتدا سے آج تک اگر نثری تصنیف پر نگاہ ڈالی جائے تو خالص سوانح عمریاں ہمیں حالی اور ان کے بعد سے ہی ملتی ہیں ورنہ نیم سوانحی کتابیں اور سوانحی منتشر عناصر دکن کی منظوم مثنویوں سے ہی ملنا شروع ہو جاتے ہیں۔ حالی نے پہلی بار مغربی اصول و نقد سوانح نگاری کو ''حیات جاوید'' میں جگہ دی۔ یہاں یہ بات دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ حالی انگریزی زبان سے واقف نہیں تھے بلکہ انھوں نے انگریزی کتابوں کے اردو تراجم کی مدد سے مغربی ادب سے واقفیت حاصل کی تھی۔ حالی سے قبل اردو میں مشرقی طرز کی سوانح عمریاں ملتی ہیں جن میں امراء، روسا، ملوک اور دیگر مذہبی شخصیات کے مختلف گوشوں پر غیر منظم طریقے پر خامہ فرسائی کی جاتی تھی اور کسی طرح کے اصول و ضوابط کی پابندی نہیں ہوتی تھی۔ ظاہر ہے ایسی صورت میں مدح و ذم کے خود تیار کردہ معیار ہوتے تھے۔ کوئی کسی کی بے جا مدح سرائی کرتا تھا تو کوئی کسی کی بے جا مذمت پر اتر آتا تھا۔ حالی نے اس روایت کو توڑا اور اردو سوانح نگاری کی دنیا میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔ انھوں نے اپنی پہلی دونوں سوانحوں ''حیات سعدی'' اور ''یادگار غالب'' میں اپنے ہیرو کے پھوڑوں کو کہیں ٹھیس لگنے نہیں دی ہے۔ (اس کا ذکر انھوں نے حیات جاوید کے دیباچے میں کیا ہے) کیونکہ ان کا زمانہ اور سوانح کے موضوعات اس کے متحمل نہیں تھے اور ان کے پیش نظر افادی مقاصد تھے۔ جہاں تک ان کی آخری تصنیف حیات جاوید کا تعلق ہے تو اس کے ہیرو سرسید احمد خاں کی شخصیت

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

نے انھیں مہمیز کیا کہ وہ نکتہ چینی کی بنیاد ڈالیں تا کہ ہیرو کی ذات عوام کے سامنے نکھر کر آجائے اور بے جا اختلافات کی گنجائش باقی نہ رہے۔ اس سلسلے میں راقم الحروف نے یہ کوشش کی ہے کہ حالی کے حد درجہ خلوص وصداقت کو دکھایا جائے۔ اس بات کو زیادہ تر نقاد تسلیم کرتے ہیں کہ حیات جاوید جدید طرز کی پہلی منظم سائنٹفک سوانح عمری ہے۔

میں نے کتاب کو چار ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے باب میں سوانح نگاری کی تعریف اور اس کے فن پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس باب کے آخر میں سوانح نگاری اور خودنوشت سوانح نگاری کا فرق واضح کیا ہے نیز سوانح عمری کے اسلوب پر بھی اظہار خیال کیا ہے۔

دوسرے باب میں سوانح نگاری کا ارتقا حالیؔ کے عہد تک پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ پس منظر کے طور پر عربی وفارسی سوانح نگاری کا ذکر بھی کیا ہے۔ اردو سوانح نگاری کی بابت میں نے دکن کے بعد شمالی ہند کے تذکروں اور دیگر سوانحی تصانیف کا ذکر اختصار کے ساتھ کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ارتقائی عمل کو دکھانے میں تاریخی کڑیوں کو ملانے کی ضرورت ہوتی ہے میں نے اس کا خیال رکھا ہے۔ عہد حالی میں حالیؔ اور شبلیؔ کا ذکر کسی قدر تفصیل سے اور دیگر سوانح نگاروں ذکاء اللہ، عبدالحلیم شرر، نذیر احمد کی سوانحی کوششوں کو محض چند جملوں کے بیان پر ہی اکتفا کیا ہے۔

تیسرے باب کے ذیل میں سب سے پہلے حالی کی شخصیت، سیرت اور سرسید سے ان کے تعلق کو مختصراً پیش کیا ہے۔ بعد ازاں سرسید کی عظمت جو ایک سوانح کے ہیرو کے لیے درکار ہوتی ہے بیان کرنے کی سعی کی ہے۔ اس کے فوراً بعد اپنے اصل موضوع ''حیات جاوید'' کے تنقیدی جائزہ کا رخ کیا ہے۔ اس ضمن میں مختلف اعتراضات کا جائزہ بھی لیا گیا ہے۔ اخیر میں حیات جاوید کے اسلوب پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

چوتھا باب خلاصے پر مشتمل ہے جس میں سارے ابواب کا اختصار کے ساتھ نچوڑ پیش کیا گیا ہے۔ بحیثیت مجموعی میری یہ کوشش اردو ادب کے بحر ذخار میں ایک قطرے کی بھی حیثیت نہیں رکھتی لیکن موضوع کی نوعیت کو دیکھتے ہوئے یہ امید کرتا

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

ہوں کہ میرے اس کام کی طرف توجہ دی جائے گی اور خامیوں کی نشان دہی بھی کی جائے گی۔

باہمی تعاون کے بغیر کسی کام کا مکمل ہونا دشوار گزار ہوتا ہے چنانچہ میرے اس کام کو میرے اساتذہ، رفقا، احباب اور عزیز واقارب کی مدد اور ان کے خلوص ومحبت نے بہت آسان کر دیا۔ خصوصاً استاد محترم پروفیسر محمد شاہد حسین کی شفقت اور خصوصی توجہ سے ہی یہ کام پایۂ تکمیل تک پہونچ سکا ہے ورنہ اپنی بساط اس راہ روکی سی تھی جو راستہ دشوار دیکھ کر سفر شروع کرنے سے پہلے ہی ہمت ہار جاتا ہے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے صدر شعبہ اردو پروفیسر اصغر عباس نے مجھے اپنے مفید مشوروں سے نوازا۔ ان کے مشوروں اور ہمت افزائی کے لیے تہ دل سے ان کا ممنون ہوں۔ میں مولانا آزاد لائبریری کے اردو سیکشن کے ذمے دار جناب میر باقر حسین صاحب کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انھوں نے مجھے میری ضرورت کے مطابق کتابیں فراہم کیں۔ اخیر میں اپنے تمام دوستوں خصوصاً ایاز احمد کی عقیدت ومحبت اور گاہے بگاہے ان کی حوصلہ افزائی اور مدد کے صلے میں اس وقت انھیں محض اپنا نذرانۂ عقیدت ہی پیش کر سکتا ہوں۔

ملک راشد فیصل

★★

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

باب اوّل

سوانح نگاری اور اس کا فن

سوانح نگاری اس لحاظ سے دوسری اصناف نثر سے مختلف ہے کہ اس میں کسی ایک کردار سے متعلق تفصیلات کو حقیقی طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ کردار کے لیے شرط ہے کہ وہ حقیقی ہو اور کسی حد تک قدر و قیمت کا حامل بھی ہو۔ غیر معروف اور گمنام شخصیات کو عموماً سوانح نگاری کا موضوع نہیں بنایا جاتا۔ سوانح تاریخ سے کہیں وسیع چیز ہے جس میں تاریخ کی صفات مدغم ہو جاتی ہیں۔ حقائق کے بیان کے ساتھ اس میں ادبی چاشنی اور حسن ترتیب کا خاص لحاظ رکھا جاتا ہے۔ سوانح نگار کا کام یہ ہے کہ وہ ہیرو کی طویل بکھری ہوئی زندگی کے مختلف حالات و واقعات کو پرکھے اور حسن انتخاب کے ساتھ انھیں قارئین کے سامنے پیش کرے۔ سوانح نگاری اسی لیے ایک مشکل اور پیچیدہ فن ہے۔ عرفی کا یہ مصرعہ کسی بھی سوانح نگار کے لیے قابلِ توجہ ہے ؎

'ہشیار کہ رہ بردم تیغ است قدم را'

اُردو سوانح نگاری انگریزی سوانح نگاری سے خاصا متاثر ہوئی ہے اور اس کے موضوع و مواد کو بہت حد تک اخذ بھی کیا ہے۔ سوانح نگاری پر مفصل بحث سے قبل ہم اس کی مختلف تعریفوں پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔ آکسفورڈ ڈکشنری میں بایوگرافی کے معنی ہیں:

''کسی شخص کے ذریعے لکھی گئی کسی فرد کی زندگی کی کہانی[1]''

---

[1] آکسفورڈ ایڈوانس لرنرس ڈکشنری، ایڈیشن ۱۹۹۶، صفحہ ۱۰۷

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

ڈرائیڈن نے سب سے پہلے ۱۶۸۳ء میں لفظ سوانح عمری کی تعریف اس طرح کی ہے

''یہ مخصوص افراد کی زندگیوں کی تاریخ ہے[۱]''

جانسن کے خیال میں ''سوانح عمری مختلف قسم کی ایسی بیانیہ تحریر ہے جسے بڑی رضامندی کے ساتھ پڑھا جائے اور بڑی آسانی کے ساتھ زندگی کے مقاصد تک جس کی رسائی ہو''[۲] اس تعریف سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سوانح لکھنے کا ایک مقصد ہوتا ہے اور وہ یہ کہ قارئین بڑی شخصیات کے مطالعے کے ذریعے اپنی زندگیوں کو قابل عمل بنائیں۔ چنانچہ سوانح محض انسان کی پیدائش، خاندان، تعلیم، مشاغل زندگی اور وفات کا بیان ہی نہیں بلکہ کسی فرد کے ظاہر و باطن، عادات واطوار، اخلاق و معاشرت، وراثت اور نفسیاتی کیفیت اور اس کی زندگی کے نشیب و فراز کا مرکب بھی ہے۔ سوانح نگار کے لیے وہ تمام باتیں دلچسپی کا باعث ہوتی ہیں جن سے شخصیت کی تعمیر کرنے اور ایک مکمل تصویر اخذ کرنے میں مدد ملے۔ سوانح عمری کی جدید تعریف انھیں باتوں کی نشاندہی کرتی ہے۔

ہیرو کی زندگی واقعات، حادثات و مسائل سے پر ہوتی ہے اور ان میں سے ہر واقعہ اپنے اندر ایک کشش رکھتا ہے اور انھیں واقعات کی کڑیوں سے زندگی کا ایک نقشہ تیار ہوتا ہے لیکن سوانح نگار کے لیے ہر واقعہ اہم نہیں۔ اسے تو واقعات کی بھیڑ سے ان اہم واقعات کا انتخاب کرنا ہے جو فرد کی زندگی پر روشنی ڈال سکیں۔ ظاہر ہے کہ ہر واقعہ نہ تو اہم ہو سکتا ہے اور نہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے اس پائے کا کہ ہیرو کی زندگی کے خدوخال نمایاں کر سکے لہٰذا سوانح نگار کے لیے واقعات کا انتخاب ایک اہم مسئلہ ہے۔ ایک سوانح نگار کے لیے وہی واقعہ اہم ہوتا ہے جس سے ہیرو کے کردار پر روشنی پڑتی ہو خواہ وہ واقعہ غیر اہم کیوں نہ ہو۔ نپولین کی زندگی میں عموماً اس کی فتوحات کو لوگ

---

۱ ڈاکٹر ممتاز فاخرہ۔ اردو میں فن سوانح نگاری کا ارتقا (۱۹۱۴ تا ۱۹۷۵ء)، دہلی ۱۹۸۴ء۔ ص ۲۳

۲ ڈاکٹر ممتاز فاخرہ۔ اردو میں فن سوانح نگاری کا ارتقا (۱۹۱۴ تا ۱۹۷۵ء)، دہلی ۱۹۸۴ء۔ ص ۲۴

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

اہمیت دیتے ہیں لیکن اس کے سوانح نگار کے لیے وہ چھوٹے چھوٹے اختلافات اہم ہیں جو نپولین اور اس کے بھائی کے درمیان پیدا ہوئے۔ اسی طرح 'حیات جاوید' میں سرسید کا نوکر کو مارنا، کسی شخص کا گفتگو کرنا یا دوستوں سے بے تکلف باتیں زندگی کی حقیقتوں کو آشکارا کر دیتی ہیں۔ سوانح عمری کو طوالت سے بچانے کے لیے Margins اپنی کتاب "Aspect of Biography" میں لکھتے ہیں:۔

> ''سوانح عمری میں یہ ضروری نہیں ہے کہ جو کچھ ہم جانتے ہیں وہ جوں کا توں پیش کر دیں اس طرح ہر شخص کی سوانح عمری اس کے ایام حیات کی طرح طویل ہو جائے گی[1]۔''

لیکن اس سلسلے میں کسی کلیے کو پیش کرنا بھی مشکل ہے بلکہ واقعات کی نوعیت پر اس کا انحصار ہے۔ واقعات کی کانٹ چھانٹ سے بظاہر زندگی کا تسلسل ختم ہوتا نظر آتا ہے لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے کیونکہ عدم تسلسل کے باوجود بھی واقعات کا سلسلہ ملتا چلا جاتا ہے۔ اس کے لیے حسن تصور اور حسن ترتیب شرط ہے۔ آکسفورڈ ڈکشنری میں سوانح کو ادب کی شاخ قرار دیا گیا ہے یعنی سوانح میں ادبیت اور حسن ترتیب پر خاص طور سے بہت زور دیا گیا ہے۔ اسی سیاق میں ڈاکٹر عبدالقیوم اپنے مضمون ''سوانح نگاری کیا ہے'' میں رقم طراز ہیں:۔

> ''نقادان فن سوانح میں صداقت اور سچائی پر بہت زور دیتے آئے ہیں لیکن محض صداقت اور خشک واقعات ہی سوانح میں دلچسپی نہیں پیدا کر سکتے بلکہ اظہارِ بیان کی خوبی اور خوش اسلوبی کو بہت دخل ہے۔ ڈاکٹر جانسن نے سوانح کو ادب کی ایک شاخ قرار دیا ہے اگرچہ اس میں شعوری طور پر ایک فرد کی زندگی کو مربوط کیا جاتا ہے اس لیے اس شعور میں تاریخ سے مدد لی جاتی

---

[1] الطاف فاطمہ۔ اردو ادب میں فن سوانح نگاری کا ارتقا، دہلی ۱۹۷۲ء، ص ۱۸

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

ہے لیکن اس کی تخلیقی صفت اور دلچسپی پیدا کرنے کی ضرورت نے ادبی اصناف سے اس کا دامن باندھ دیا ہے اس لیے ایک سوانح میں تاریخ، فرد واحد اور ادبی چاشنی تینوں کی آمیزش ہوتی ہے اور یہی حسن ترتیب اس کے حسن کا سبب بن جاتی ہے[1]۔"

مذکورہ اقتباس سے تاریخ و سوانح کا فرق واضح ہو جاتا ہے۔ یہاں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ابتدائی دور میں سوانح عمری اور تاریخ میں کوئی واضح فرق نہیں تھا بلکہ سوانح عمری کو تاریخ ہی کا ایک جز مانا جاتا تھا کیونکہ مؤرخ کی طرح سوانح نگار بھی واقعات و حادثات کی اصل حقیقت بیان کرتا ہے۔ جدید اصولوں کی روشنی میں سوانح عمری اور تاریخ میں فرق کیا جا سکتا ہے۔ دونوں کے اس فرق کو ڈاکٹر سید شاہ علی کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں۔

"سوانح عمری کا موضوع ایک انسان ہے اور تاریخ کا ایک ملک۔ سوانح نگار کے لیے ہجوم ثانوی اہمیت رکھتا ہے اور تاریخ کے لیے افراد، خواہ وہ کتنے ہی بڑے کیوں نہ ہوں ضمنی حیثیت رکھتے ہیں۔ مؤرخ انسانوں کا ایک دوربین کے ذریعے اور سوانح نگار منفرد آدمیوں کا ایک خوردبین کے تحت مشاہدہ کرتا ہے۔ تاریخ ہمیں سرکاری ایوانوں میں لے جاتی ہے، سوانح عمری نجی قیام گاہوں میں۔ تاریخ میں ایک فاتح کی سپاہیانہ صفات اہم ہوتی ہیں اور سوانح نگاری میں اسے بحیثیت انسان پیش کیا جاتا ہے[2]۔"

سوانح نگاری میں موضوع بنیادی اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ سوانح نگاری کو موضوع کے انتخاب کے وقت دانش مندی، دیانت داری اور غیر جانبداری سے کام لینا چاہیے۔ موضوع کے لحاظ سے سوانح نگاری کی دو قسمیں کی جا سکتی ہیں۔ ایک تو وہ

---

[1] ڈاکٹر فرمان فتح پوری۔ (مرتب)۔ اردو نثر کا فنی ارتقا، دہلی ۱۹۹۷ء، ص ۳۲۰

[2] ڈاکٹر سید شاہ علی۔ اردو میں سوانح نگاری، کراچی۔ ۱۹۶۱ء ص ۳۹

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

سوانح جس کا ہیرو سوانح نگار کا کوئی ہم عصر ہو یا ایک ایسا شخص ہو جس کی زندگی سے متعلق اہم معاملات کے بارے میں وہ براہ راست معلومات حاصل کرنے کا اہل ہو۔ ایسی صورت میں سوانح نگار اپنے ذاتی ربط، ہم عصر لوگوں کے تاثرات، حالات کی ضروری تفصیلات کے بارے میں علم اور اپنے موضوع کے ذہنی و سماجی پس منظر سے واقفیت کی بنا پر ایک ایسا مرقع تیار کر سکتا ہے جو اس کے ہیرو کی سیرت کو بھرپور طور پر پیش کر سکے اور اس کے کردار کے پنہاں گوشوں کو اجاگر کر کے اور نمایاں پہلوؤں سے انھیں ہم رشتہ کر کے ایک نئی بصیرت پیدا کر سکے۔

موضوع کے اعتبار سے سوانح نگاری کی دوسری قسم وہ ہے جس کا ہیرو کوئی ایسا فرد ہے جس سے سوانح نگار زمانے کے لحاظ سے کوئی قربت نہیں رکھتا۔ ایسی سوانح کے لیے سوانح نگار کو اپنا مواد حاصل کرنے کے لیے بڑی چھان بین کرنی پڑتی ہے۔ اس کو تاریخ، وقائع، خطوط، یادداشتوں، ڈائریوں اور اس عہد کے دوسرے افراد کی سوانحوں سے اپنے لیے معلومات حاصل کرنی پڑتی ہے۔ ظاہر ہے کہ کبھی کبھی ان معلومات میں کہیں کہیں خلا رہ جاتا ہے جس کو پر کرنے کے لیے سوانح نگار کو اپنے منطقی استدلال، تخئیل یا قیاس سے بھی مدد لینی پڑتی ہے۔

موضوع کے انتخاب کے ساتھ ایک بڑا مسئلہ سوانح نگار کے نظریات کا ہیرو کے نظریات سے مطابقت کا ہوتا ہے۔ عموماً سوانح نگار ایسی شخصیات کا انتخاب کرتا ہے جن کے نظریات اس کے مزاج کے موافق اور ہم آہنگ ہوں۔ نظریات کے ٹکراؤ کی صورت میں ہیرو کے محاسن بھی معائب میں بدل جاتے ہیں مزید یہ کہ سوانح کا حسن زائل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ سوانح نگار کی ہیرو سے ذہنی مطابقت ضروری ہے۔

سوانح نگار کو قلم کی پوری آزادی حاصل ہونی چاہیے کیونکہ اس کے بغیر غیر جانبداری کا عنصر پیدا ہونا مشکل ہے۔ اسی کے ساتھ سوانح نگار کی اپنے موضوع سے دلچسپی و ہمدردی بھی ضروری ہے لیکن خلوص و ہمدردی کا مطلب جانبداری یا قصیدہ خوانی نہیں بلکہ ہیرو کے کردار اور اس کی شخصیت کا غیر جانبداری سے مطالعہ کرنا ہے۔

موضوع کے انتخاب کے بعد سوانح نگار کے لیے سب سے بڑا مسئلہ مواد کی

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

فراہمی کا ہوتا ہے۔ اس کے لیے اسے بے حد کاوشیں کرنی پڑتی ہیں۔ اس کے لیے اسے مختلف ماخذ کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ ایک ذریعہ خود ہیرو کی اپنی تحریریں ہیں جنھیں خود نوشت مواد کہا جاتا ہے مثلاً روزنامچے، یادداشتیں، خطوط اور دیگر تصانیف۔ دوسرا ذریعہ خود اس کی اپنی ذات ہے یعنی اس کی گفتار و کردار، اقوال و اعمال، لطائف، ظرائف وغیرہ۔ تیسرا ذریعہ اس کے دوست احباب، معاصر، اخبار و رسائل اور سوانح نگار کی ذاتی اور عام معلومات ہیں۔

سوانح کے مواد میں سب سے زیادہ اہمیت خودنوشت کو حاصل ہے۔ چونکہ ہیرو اس کے ذریعے خود اپنے بارے میں حقائق و کوائف کا اظہار کرتا ہے اور اپنی ذات کا انکشاف کرتا ہے اس لیے اس کی صحت کے سلسلے میں زیادہ شک و شبہات کی گنجائش نہیں ہوتی۔ یہ براہ راست اور بلاواسطہ ذریعہ ہوتا ہے اور دوسرے ذرائع سے جو مواد حاصل ہوتا ہے وہ لازمی طور پر اس سے متاثر ہوتا ہے نیز یہ کہ اس میں حقائق کو شعوری یا غیر شعوری طور پر نظر انداز بھی کیا جا سکتا ہے۔ یہ کہنا بجا ہوگا کہ ہیرو بھی غلط بیانی کر سکتا ہے لیکن ایسا اس کی نوعیت پر منحصر ہوتا ہے۔ انگریزی سوانح نگاری میں باسول نے خود نوشت اور ہیرو کے ذریعے حاصل کردہ مواد سے خوب استفادہ کیا۔ اس سے قبل بھی چند سوانح نگاروں نے اس طریقے کو برتا تھا جن میں قابل ذکر والٹن اور میسن ہیں۔ اسی لیے والٹن پہلا شعوری اور فنی سوانح نگار سمجھا جاتا ہے۔ باسول نے جانسن کی سوانح لکھ کر انگریزی ادب میں ایک بلند مقام حاصل کیا۔ اس کی تالیف سے فن سوانح میں ایک نئے انداز کی ابتدا ہوئی۔ اس نے سوانح کے تمام اجزا کو ایک وحدت میں پرو دیا جو اس سے پہلے انگریزی ادب میں معدوم تھا۔ اس نے ہر واقعے کو خود بولنے کی اجازت دی ہے اور کسی واقعے کو اپنے ذاتی تاثرات سے آلودہ نہیں ہونے دیا۔ مگر اردو سوانح عمریوں میں عقیدت اور ذاتی تاثرات نے فنی خوبیوں کو آگے نہیں بڑھنے دیا۔ اس خامی کا شکار مولانا حالی بھی ہیں اور مولانا شبلی بھی۔ سید سلیمان ندوی نے تو ذاتی خیالات کو حقائق پر ترجیح دی ہے۔

مواد کے حصول و غیر حصول کے سلسلے میں سید شاہ علی نے سوانح عمریوں کو

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

مختلف خانوں میں بانٹا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

"یہ صحیح ہے کہ بعض ایسی سوانح عمریاں بھی پائی جاتی ہیں جن میں سوانح نگاروں کو مواد کے بجائے صرف اپنی صناعی پر بھروسا کرنا پڑتا ہے مثلاً حالی کی حیات سعدی، انگریزی میں کارلائل کی حیات اسٹرلنگ، ایلٹ کی حیات جان گلی (Gilly) اور پامر کی حیات الائس فریمن پامر۔ ایسی سوانح عمریاں بھی موجود ہیں جن سے ظاہر ہے کہ اس قسم کے دستاویزات کی ادبی خوبی میں سوانح نگار کی صناعی نے چار چاند لگا دیے ہیں مثلاً یادگار غالب۔ ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں جن کے لیے اس قسم کا مواد حاصل کرنے میں سوانح نگار کو غیر معمولی دوڑ دھوپ کرنی پڑی ہے مثلاً باسول کی حیات جانسن اور ایسی بھی جن کی تصنیف میں ایسی محنت نہیں کرنی پڑی اور بنا بنایا مواد مل گیا مثلاً لاک ہارٹ کی حیات اسکاٹ[۱]"

روزنامچوں اور یادداشتوں کے ذریعے مواد کی مناسب ترتیب وتہذیب میں بھی مدد ملتی ہے لیکن ہر ہیرو اپنا روزنامچہ نہیں رکھتا خصوصاً مشرقی ممالک میں روزنامچے اور یادداشتیں بہت کم لکھی جاتی ہیں۔ بہر حال جو کچھ بھی اور جتنا بھی میسر ہو اس سے واقعات کو سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے۔

سوانح نگاری کے لیے مواد کے طور پر خطوط مشرق ومغرب میں یکساں اہمیت کے حامل رہے ہیں۔ خطوط بجائے خود ادب کی قدیم ترین شکلوں میں سے ہیں لیکن ان کا تعلق شخصیت سے جڑا ہوتا ہے اس لیے انھیں سوانح عمریوں میں حسب ضرورت استعمال کیا جاتا ہے۔ انگلستان میں بہت پہلے سے ان کا استعمال تھا۔ والٹن، ملسین، باسول وغیرہ بھی ان سے مستفید ہوئے ہیں۔ اردو ادب میں حالی نے یادگار غالب اور حیات جاوید لکھتے ہوئے خطوط سے مواد حاصل کیا۔ بعض ایسے مسائل جو کسی

۱ ڈاکٹر سید شاہ علی۔ اردو میں سوانح نگاری، کراچی۔ ۱۹۶۱ء ص ۲۰

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

اور کے ذریعے سے حل نہیں ہو سکے حالی نے خطوط کی مدد سے انھیں حل کرنے کی کوشش کی ہے۔ غالب کے خطوط دراصل اپنے دور کی تہذیبی، ثقافتی، سیاسی و سماجی حالات کے عکاس ہیں۔ چنانچہ ان کے سوانح نگار کو موضوع اور عہد سمجھنے کے لیے ان سے استفادہ کرنا ضروری ہے۔ اس کے باوجود خطوط سے استفادہ کرتے ہوئے بھی سوانح نگار کو احتیاط سے کام لینا چاہیے کیونکہ کبھی کبھی خطوط باعظمت سوانح عمریوں کے ادبی وصف کو بڑھانے میں مانع ہوتے ہیں۔ خطوط کا صحیح اور منصفانہ استعمال سوانح نگار کی قابلیت پر منحصر ہے۔ سوانح نگار کو ایسے خطوط کا انتخاب کرنا چاہیے جو بالواسطہ موضوع کی شخصیت پر روشنی ڈالتے ہوں۔ خطوط کے فنی استعمال میں تخلیقی تخیل سے کام لینے کی ضرورت ہے کیونکہ مرورِ ایام کے ساتھ انسان میں نفسیاتی تغیر و تبدل بھی ہوتا رہتا ہے۔

مذکورہ بالا روزنامچوں، یادداشتوں اور خطوط وغیرہ کے علاوہ ہیرو کی مختلف تحریریں، تقریریں اور تصنیفات بھی اس کی سوانح حیات کے لیے مواد فراہم کر سکتی ہیں۔ اگر اول الذکر چیزیں ہیرو کی دلی کیفیات کی آئینہ دار ہوتی ہیں تو مؤخر الذکر چیزیں فکری و فنی صلاحیتوں کو روشن کرتی ہیں۔ لہٰذا سوانح نگار کو بہت پھونک پھونک کر قدم رکھنا پڑتا ہے۔

سوانح نگار کے لیے ہیرو کے اقوال (ملفوظات) و اعمال، لطائف و ظرائف اور مصنف کی ذاتی معلومات بھی سوانح کی ترتیب میں معاون ثابت ہوتی ہیں۔ معلومات کی فراہمی کے لیے ہیرو کے خاندان کے دیگر افراد سے مدد لی جا سکتی ہے۔ ملفوظات کو صحت کے ساتھ پیش کرنے کے لیے ضروری ہے کہ انھیں فوراً قلم بند کر لیا جائے۔ اس عمل میں بھی حسن انتخاب کا سلیقہ ہونا چاہیے۔

ہم عصر افراد اور اخبارات و رسائل کے تراشے ہیرو کے لیے پس منظر کا کام دیتے ہیں۔ لہٰذا سوانح نگاری کے لیے معاصرین کی شہادتوں کے ساتھ اخبارات و رسائل کی فراہمی بھی ضروری خیال کی جاتی ہے۔ عموماً سوانح نگار کو اپنے ہیرو سے عقیدت سی ہوتی ہے۔ اسی طرح اس سے عداوت بھی ہو سکتی ہے۔ ایسے سوانح نگار کم ملیں گے جن میں ان دونوں میں سے کوئی بات نہ ہو۔ ایسی حالت میں معاصر تاثرات بہت

Scanned by CamScanner

مفید ثابت ہوتے ہیں اور ہیرو کے متعلق ایک صحیح اور صحت مند تصور قائم کرنے میں معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔ زمانی اعتبار سے سوانح عمریاں کس قدر متاثر ہوتی ہیں اس کا تجزیہ کرتے ہوئے ڈاکٹر عبدالقیوم لکھتے ہیں:۔

''سوانح میں اپنے دور کی تاریخی، سیاسی، معاشی اور معاشرتی کشمکش کا اظہار ہوتا ہے۔ بغیر اس کے کوئی سوانح مکمل نہیں ہو سکتی کیوں کہ ہیرو جس ماحول میں پرورش پاتا ہے اس کے اثرات اس کی زندگی پر حاوی ہوتے ہیں۔ اس لیے کسی فرد کی سیرت اور ذہنی ارتقاء کے بغیر اس دور کی تمدنی زندگی کو نہیں سمجھا جا سکتا لیکن یہاں بھی وہی باتیں بیان کرنی چاہئیں جو ہیرو کی زندگی سے براہ راست تعلق رکھتی ہوں۔ تاریخی و سماجی پس منظر اس حد تک ہونا چاہیے کہ ہیرو کے کردار پر روشنی پڑ سکے۔ محض تمدنی زندگی کی آئینہ داری بیوگرافر کا موضوع نہیں ہوتی۔ ایک اچھی سوانح میں یہ پس منظر اس طرح ملا جلا نظر آنا چاہیے کہ نہ تو شخصیت اس میں چھپ کر رہ جائے اور نہ محض شخصیت ہی کا غلبہ رہے[1]''

بہر حال معاصرانہ معلومات ایسی قیمتی اور مفید ہوتی ہیں کہ ان کو نظر انداز کرنا ہر حالت میں نامناسب ہے۔ پیدائش سے موت تک مختلف افراد ہیرو کی شخصیت کے ارتقا کے شاہد ہوتے ہیں جن میں بعض کا تعلق اور ان کی معلومات گہری ہوتی ہیں۔ وہ اس کے کردار کی خوبیوں اور خامیوں سے واقف ہوتے ہیں چنانچہ ایسے لوگوں کی شہادتیں بہت مفید ثابت ہوتی ہیں۔ ہیرو سے متعلق اس کے دوست احباب اور معاصرین کا تحریری یا تقریری اظہار خیال خواہ وہ گفتگو کی شکل میں ہو یا تقاریر کی، خطوط کی یا روزنامچوں کی، مضامین کی یا نظموں کی، ایسا ہی اہم ہے جیسا ہیرو کی اپنی تحریر و تقریر۔ سوانح نگار کی ذاتی معلومات پر بھی یہی چیز صادق آتی ہے۔ سوانح نگار کو خود

[1] ڈاکٹر فرمان فتح پوری۔ اردو نثر کا فنی ارتقا، دہلی۔ ۱۹۹۷ء ص ۲۲۔۳۲۱

www.urduchannel.in

پر پورا اعتماد ہوتا ہے اور وہ اپنے تعلقات، مشاہدات و تجربات سے بھرپور فائدہ اٹھاتا ہے۔ لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ سوانح نگار کو کبھی ہیرو کی زندگی میں اس کی سوانح عمری لکھنے کا خیال نہ آیا ہو یا ہیرو کی زندگی کے ابتدائی، درمیانی یا آخری دور سے اسے نیاز حاصل نہ رہا ہو یا اس کی زندگی کے بعض مدارج یا مظاہر سے وہ ناواقف رہا ہو۔ ایسی صورت میں اسے لامحالہ ہیرو اور دیگر ذرائع سے حاصل کردہ مواد پر تکیہ کرنا پڑے گا۔

سوانح نگاری کے فن سے متعلق بحث کرتے ہوئے یہ بیان کرنا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس کے لیے کون کون سی چیزیں نقصان دہ ثابت ہو سکتی ہیں یا سوانح نگار کو سوانح لکھتے ہوئے کن طریقوں کو نظر انداز کرنا چاہیے۔ اس تعلق سے ڈاکٹر سید شاہ علی نے اپنی کتاب ''اردو میں سوانح نگاری'' میں بھرپور بحث کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ۔

> ''سوانح نگاری انسان کے اخلاقی، تاریخی یا سائنسی تجسس سے آزاد ہے۔ ان عظیم مفادات کو اس سے ضمنی مدد مل سکتی ہے لیکن یہ اس کے مقاصد میں شامل نہیں ہے[1]''

آگے چل کر وہ اخلاقی طریقہ کے تحت لکھتے ہیں:۔

> ''اخلاقیات سے اس کا تعلق تین طرح کا ہو سکتا ہے جو غلط ہے اور اس کے اصل مقصد پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اول یہ کہ وہ کسی اخلاقی نظریے کی تائید کے لیے استعمال کی جائے یا اس کے ذریعے اچھے اخلاق کی اشاعت کی کوشش کی جائے۔ دوم یہ کہ بداخلاقی پر پردہ ڈالنے کی سعی کی جائے۔ سوم یہ کہ ذاتی تعلقات کی بنا پر کسی کی مدح یا مذمت کی جائے۔ یہ سب سچائی اور صاف گوئی کی، جو سوانح نگاری کا اصل اصول ہے، خلاف ورزی کرتے ہیں[2]''

---

[1] ڈاکٹر سید شاہ علی۔ اردو میں سوانح نگاری، کراچی۔ ۱۹۶۱ء ص ۳۰

[2] 〃 〃 〃 〃 〃 〃

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

دراصل سوانح نگاری کا مقصد ہیرو کی ہو بہو تصویر کھینچنا ہوتا ہے تا کہ قاری کے ذہن میں اس کی پوری زندگی نقش ہو جائے۔ اسے موافق اور مخالف دونوں چیزوں کو ایک نظر سے دیکھنا ہوتا ہے۔ سوانح نگار واقعہ نگار ہوتا ہے اور صاف گوئی اور سچائی اس کی تحریر کے اہم عناصر ہیں۔ اسے ہیرو کی زندگی کے روشن اور تاریک پہلوؤں سے محبت نہیں بلکہ اس کا کام غیر جانبدارانہ اور سچی مرقع کشی ہے۔ چنانچہ اخلاقی تبلیغ سے سوانح نگاری بالکل بے نیاز ہے۔ سوانح نگار کا کام یہ ہے کہ وہ ہیرو کی خوبیوں اور خرابیوں، نیکیوں اور بدیوں سب کو بیان کرے اور ان چیزوں کے اخذ و ترک کو قاری کے اوپر چھوڑ دے۔ اس سلسلے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ بڑے آدمیوں کی سوانح عمریاں عزم و حوصلہ پیدا کرتی ہیں اور ان کے عیوب کو بیان کرنے سے یہ مقصد زائل ہو جاتا ہے لہٰذا ان کا اظہار خصوصاً ان کی موت کے بعد نامناسب ہے۔ لیکن یہ استدلال کرتے ہوئے اس بات کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے کہ انسان کی عظمت اس کی بشریت ہی میں ہے نہ کہ فوق البشریت میں۔ انسان کی کمزوریاں ہی اس کی قوت ارادی کو قابل تقلید بناتی ہیں۔ اسی طرح رہنمائی کرتے ہوئے ڈاکٹر امیر اللہ خاں شاہین سوانح نگار کو مشورہ دیتے ہیں:۔

> ''حیات نگار کو اپنے موضوع کی کمزوریوں کا کھل کر اعتراف کر لینا چاہیے ورنہ یہ زبردست اخلاقی گراوٹ سمجھی جائے گی جو اس شخص کے مرنے کے بعد بلا سبب حیات نگار نے اپنے سر لے لی ہے۔ بزرگوں کی خطاؤں میں ہدایت بھی ہوتی ہے تا کہ نئے آنے والے ان پامال راہوں سے بچ کر چلیں۔ بزرگ فوق البشر تو نہیں ہوتے جبکہ یہ ذہنیت انھیں فوق البشریت کے مرتبے پر فائز کر دیتی ہے، جن کی ہر بات، جن کا ہر قول وحی و الہام ٹھہرایا جاتا ہے[1]''

اسی طرح ڈاکٹر سید شاہ علی سوانح نگار کو کچھ قیمتی مشورے دیتے ہیں، جو سوانح

---

[1] ڈاکٹر امیر اللہ خان شاہین۔ فن سوانح نگاری اور دیگر مضامین، دہلی ۱۹۷۳ء، ص ۱۲۸

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

کے فن کو سمجھنے کے لیے بہت اہم ہیں:۔

''سوانح نگار کو دقت نظری، صبر، محنت، تحقیق، ترمیم و انتخاب کی اہلیت اور انتہائی صحت کا جو رکھ رکھاؤ اور جذباتیت یا رومانیت سے خالی ہو، مالک ہونا چاہیے۔ اسے ترازو کے پلڑے متوازی رکھنے چاہئیں۔ ماضی و مستقبل پر نظر رکھنی چاہیے اور وقتی جماعتی تکدر سے کان بند کر لینے چاہئیں۔ اسے ان منصفانہ اور فیاضانہ اصولوں پر کاربند رہنا چاہیے جو ایک ناقد دوست کے فیصلے کو متحرک کرتے ہیں۔[۱]''

سوانح نگار کو تاریخی طریقہ اپنانے سے بھی پرہیز کرنا چاہیے یعنی حقائق کو خشک انداز میں بیان کرنا تاریخ کا کام ہے، سوانح کا نہیں۔ سوانح اور تاریخ کا فرق واضح کیا جا چکا ہے۔ زمانہ قدیم میں سوانح نگاری تاریخ کی ایک شاخ سمجھی جاتی تھی۔ چین میں سوانح عمری کو تاریخ سے الگ اور آزاد تصور کیا جاتا تھا لیکن یہ بحث دیگر ممالک میں اتنی واضح نہیں ہے۔ عرب اور ایران میں سوانح عمری کا تاریخ سے بالکل جداگانہ تصور نہیں ملتا۔ یہاں تک کہ شبلی بھی جو اردو سوانح نگاروں میں علوم اسلامی سے زیادہ متاثر ہیں، اپنی تصانیف میں سوانح عمری اور تاریخ کو خلط ملط کر دیتے ہیں۔ یورپ میں بھی ایک زمانے تک سوانح عمری کا شمار تاریخ کے تحت کیا جاتا تھا۔ یہاں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ سوانح اور تاریخ میں جہاں کچھ موافقت اور یکسانیت ہے وہیں امتیازات و اختلافات بھی ہیں۔ دونوں کے موضوعات و مقاصد جداگانہ ہیں۔ سوانح اور تاریخ کے فرق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ڈاکٹر عبدالقیوم اپنے مضمون ''سوانح نگاری کیا ہے'' میں رقم طراز ہیں:۔

''سوانح میں ایسے واقعات اور حالات ظاہر ہونے چاہئیں جن میں آپس میں مطابقت اور تعلق اور جو ہمارے ذہنی اور دماغی رجحانات کے ساتھ بھی ہم آہنگ ہو سکیں۔ سوانح میں اس شخصی

---

۱ ڈاکٹر سید شاہ علی۔ اردو میں سوانح نگاری، کراچی۔ ۱۹۶۱ء ص ۳۷

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

رشتے کی کارفرمائی ایک امتیازی بات ہے اور سوانح کو تاریخ سے یہی رشتہ علیحدہ کرتا ہے۔ یہ تعلق سوانح میں ایک جگہ مجتمع ہو جاتا ہے مگر تاریخ میں باقی نہیں رہتا۔ اس لیے یہ کہنا درست ہے کہ سوانح مصنف کی دماغی ساخت کا نتیجہ ہوتی ہے مگر اس کے ماحول اور سماجی حالات سے متاثر بھی ہوتی ہے[1]''

ڈاکٹر سید شاہ علی نے سائنسی طریقے کے تحت انسان کے موروثی حالات اور اس کا شجرۂ نسب، انسان کے موروثی اور اکتسابی اوصاف کا تجزیہ، اس تجزیے کی ضرورت اور اس کا امکان، علم نفسیات اور فن سوانح نگاری کا باہمی تعلق وغیرہ جیسے مسائل کا ذکر کیا ہے اور اس طریقے کو سوانح نگاری کے لیے غلط قرار دیا ہے۔ ان کے نزدیک نسبی تفصیلات کا کسی سوانح عمری کی عمدگی سے کوئی خاص تعلق نہیں ہے۔ مثلاً ہمارے سامنے سوانح نگاری کا بہترین نمونہ باسول کی حیات جانسن موجود ہے جو بغیر ہیرو کی نسبی تفصیلات کے جائزے کے کامیاب ہے اور ایک اور سوانحی شاہ کار لاک ہارٹ کی ''حیات اسکاٹ'' ہے جسے ان تفصیلات سے کچھ زیادہ فائدہ نہیں ہوا۔ عصر حاضر کی سوانح نگاری کے سلسلے میں ڈاکٹر سید شاہ علی کا ماننا ہے کہ:۔

''موجود حالات میں یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ گو خاندان اور احباب موضوع کا ایک حصہ بلکہ اکثر ایک بڑا حصہ ہوتے ہیں لیکن یہ ہیرو ہی کی شخصیت ہے جو مرکزی اور اہم ہے۔ ستم ظریفی تو یہ ہے کہ اس وقت بھی جب کہ ہیرو ایک الگ تھلگ زندگی بسر کرتا ہے اس کے دوست احباب کے ذکر کو ٹھونس دیا جاتا ہے اور خاندان کے معاملے میں تو مناسبت کے اصولوں کو بے طرح نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ اور اسلاف کے متعلق یہ روایتی پہلا باب سخت الجھن کا باعث ہوتا ہے۔ سوا خاص موقعوں کے موروثی اثرات کے بارے میں اس قسم کی تحقیقات چاہے وہ

---

[1] ڈاکٹر فرمان فتح پوری (مرتب)۔ اردو نثر کا فنی ارتقاء، دہلی ۱۹۹۷ء، ص ۳۲۵

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

پہلی پشت تک ہی کیوں نہ ہو سوانح نگار کے لیے اکثر ایک دام
تزویر ثابت ہوتی ہیں۔ گو سائنسی نقطۂ نظر سے یہ اہم ہو لیکن
اصول اتحاد سے اصل سوانح عمری سے خارج کر دے گا۔ بے
حد ضروری بھی تفصیلات کے علاوہ سب چیز زیادہ سے زیادہ ایک
ضمیمے کی شکل میں ملحق کیا جا سکتا ہے۔[1]

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہیرو سے متعلق جزئیات اور نجی و ذاتی حالات کو سوانح میں جگہ دی جا سکتی ہے یا نہیں۔ جزئیات کی بھی کئی قسمیں کی جا سکتی ہیں مثلاً اہم اور غیر اہم، نجی اور عمومی وغیرہ۔ ان کے انتخاب کے سلسلے میں بھی مختلف رائیں دی جاتی ہیں مثلاً بعض کا خیال ہے کہ صرف نمایاں خصوصیات لی جانی چاہئیں۔ بعض کا خیال ہے کہ جزئیات و متعلقات کے ساتھ پیش کرنا چاہیے۔ اس کا قول ہے کہ

"ان واقعات پر جو محض مادی عظمت یا اثر و اقتدار کا باعث
ہوتے ہیں سرسری نظر ڈالتے ہوئے گزر جانا اور خیالات کو نجی
کوائف میں لے جانا اور زندگی کی باریک جزئیات کو نمایاں کرنا
ہی فن کاری ہے۔[2]"

سوانح عمری کی تالیف میں خطوط اور یادداشتوں سے واضح تفصیلات کو اخذ کرنا قارئین کے لیے بڑی دلچسپی کا باعث ہوتا ہے۔ قاری کو عام حالات پڑھتے پڑھتے ہیرو کی کوئی ذاتی دلچسپ چیز مل جاتی ہے تو اس کی طبیعت خوش ہو جاتی ہے اور اس کے اپنے اثرات قائم ہوتے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی تفصیلات کو بے کار مواد میں نہیں شامل کرنا چاہیے۔ ہر چیز جو ہیرو کی گفتگو، رنگ ڈھنگ، آواز، طریقۂ اظہار، حرکات و سکنات وغیرہ سے متعلق ہو، مفید اور اہم ہے۔ ہر وہ چیز جو ہیرو سے مخصوص ہے اس کی سوانح عمری میں ضرور شامل کرنا چاہیے۔ اس طرح کی ذاتی اور انفرادی خصوصیات

---

۱ ڈاکٹر سید شاہ علی۔ اردو میں سوانح نگاری، کراچی۔ ۱۹۶۱ء ص ۴۳-۴۲

۲ ڈاکٹر سید شاہ علی۔ اردو میں سوانح نگاری، کراچی۔ ۱۹۶۱ء ص ۴۵

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

کے ذریعے سوانح نگار ہیرو کی ایک زندہ تصویر پیش کرتا ہے جو مورخ کے دائرۂ اختیار میں نہیں۔ یہی طریقہ ہے جس کو اختیار کر کے سوانح نگاری شخصیت کو سچائی اور دانائی کے ساتھ پیش کر سکتی ہے اور کسی جوہر قابل کی دلی کیفیات اور معائب و محاسن پر نظر ڈالنے کا موقع فراہم کرتی ہے نیز یہ پائدار عظمت کے لیے محنت، جفاکشی، اخلاقی اوصاف اور خداداد صلاحیتوں کی ضرورت کو بھی واضح کرتی ہے۔ یہی چیزیں ہیں جن کی وجہ سے سوانح نگاری تمام اصناف ادب میں سب سے زیادہ سبق آموز اور دلچسپ قرار دی جاتی ہے۔

سوانح عمری طویل بھی ہو سکتی ہے اور مختصر بھی۔ طویل سوانح عمری میں اس بات کا خیال رکھا جاتا ہے کہ کوئی گفتنی بات نہ رہ جائے۔ مختصر سوانح عمری میں مختلف مسائل پر طبع آزمائی کی گنجائش نہیں ہوتی حالانکہ دونوں قسم کی سوانح عمریاں اپنی اپنی جگہ پر اہمیت کی حامل ہیں۔ اسٹفن اور پیوتارک کا ماننا ہے کہ طوالت اور بیجا پرتی موضوع سے قربت یا عقیدت کا نتیجہ ہوتی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ سوانح عمری کی طوالت و اختصار کا فیصلہ دستیاب شدہ مواد کی جملہ مقدار، موضوع کی اہمیت اور دستاویزی شہادت کی حقیقی قدر و قیمت کی بنیاد پر کرنا چاہیے۔ اس فیصلے میں حیات و کردار کا تنوع اور شخصیت کے مختلف پہلو بھی اہم رول ادا کرتے ہیں مثلاً سرسید کی کی مختلف النوع شخصیت کے گوناگوں پہلو سوانح نگار کو مختلف چیزوں کے جائزے پر مجبور کرتے ہیں۔ یہاں پر سوانح نگار کی سمجھ بوجھ اور ترک و انتخاب کی صلاحیت بڑی معنی خیز ثابت ہوتی ہے۔ انتخاب میں ہیرو کی شخصیت کو مدنظر رکھنا ہوتا ہے کہ کہیں کوئی غیر ضروری چیز نہ شامل ہو جائے یا ایسی ضروری چیز نہ رہ جائے جس سے شخصیت پر روشنی پڑتی ہو۔ ڈاکٹر امیر اللہ خان شاہین لکھتے ہیں:۔

> ''تاہم حالات کی اس تراش خراش اور کانٹ چھانٹ میں بڑی احتیاط درکار ہے۔ معمولات کا اعادہ محض بیکار ہوگا۔ یہ معمولات اس کے شخصی بھی ہو سکتے ہیں اور وہ بھی جو انسانوں میں قدر مشترک کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کو شامل کر کے تحریر کو بوجھل نہ کرنا ہی بہتر

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

ہے۔ ان واقعات کو چھانٹ لینا چاہیے جن کی تطبیق دوسرے حالات سے اور چند در چند روایات سے ہوتی ہو۔ شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو الٹ پلٹ کر دیکھنا چاہیے۔ ذاتی معائب و محاسن کو بے کم و کاست بیان کر دینا ناگزیر ہے۔ اگر ایسا کرنے کی جرأت نہ ہو تب جانسن کے بقول موضوع کو چھونا ہی نہ چاہیے۔ حیات نگار میں اخلاقی جرأت کمال درجے کی ہونی چاہیے ورنہ وہ اپنے موضوع سے انصاف نہ کر سکے گا۔ اپنی تحقیق و جستجو کے دوران اسے جو چیز معلومات حاصل ہوں دیانت و صاف گوئی سے بیان کرنا چاہیے۔[1]"

جدید سوانح نگار لٹن اسٹریچی تفصیلات کی موافقت نہیں کرتا۔ وہ بھاری بھرکم مفصل اور مستند سوانح عمریوں کا مخالف ہے جن میں بغیر کسی انتخاب اور مرکزی تخیل کے صاحب تذکرہ کے متعلق واقعات کا ایک انبار جمع کر دیا جاتا ہے جس سے نہ پڑھنے والے کو دلچسپی ہو سکتی ہے اور نہ شخصیت کے خدوخال نمایاں ہوتے ہیں۔

فن سوانح نگاری کے لوازم میں سب سے اہم عنصر سوانح نگار کی شخصیت ہے۔ ایمرسن کا کہنا ہے کہ ایک عظیم آدمی کی ضرورت ہے تاکہ ایک عظیم تر آدمی کی تشریح کر سکے۔ عظمت کے علاوہ یہ شرط بھی لگائی جاتی ہے کہ سوانح نگار کو ہیرو کے گرد و پیش کے حالات سے، اس کے مناقشات سے اور اس کے اوصاف و کمال سے آگہی ہو اور انہی چیزوں میں مہارت اور دلچسپی ہو جن سے ہیرو کو تخصیص ہو۔ مگر ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں جو ان شرائط کو پورا نہیں کرتیں۔ پھر بھی عمدگی کے معیار پر پہونچتی ہیں۔ باسول اور جانسن میں عظمت کے لحاظ سے کوئی مناسبت نہیں ہے اور حیات جانسن دنیا کی بہترین سوانح نگاری قرار دی جاتی ہے۔ امیر اللہ خان شاہین کا خیال ہے کہ:۔

"حیات نگار کی شخصیت موضوع کی شخصیت سے عظیم ہو تو اچھا ہوتا ہے۔ گو عام امکان میں ایسا کم ہی ہوتا ہے۔ لکھنے والا قلم ہی

---

[1] ڈاکٹر امیر اللہ خان شاہین۔ فن سوانح نگاری اور دیگر مضامین، دہلی ۱۹۷۳ء، ص ۲۳۔۱۲۲

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

اس وقت ہاتھ میں لیتا ہے جب موضوع کے کارنامہ ہائے
حیات، زندگی کے اعمال وافکار اور سیرت وکردار کی بلندی وپختگی
اسے اپنا گرویدہ بنالیتی ہے ورنہ پیشہ ورانہ سوانح عمریاں عرضی
نویس اور محرر کی تحریر سے زیادہ وقعت نہیں رکھتیں[1]"

حقیقت یہ ہے کہ سوانح نگاری کے لیے سوانح نگار کی عظمت کی صرف اسی حد تک ضرورت ہے جہاں تک فن سوانح نگاری کو مقصود ومطلوب ہو۔ زیادہ عملی بات یہ ہوئی کہ صحیح ہیرو کا انتخاب کیا جائے اور اس کی داستان حیات کو مناسب طور پر یعنی صحت، صاف گوئی، ہمدردی اور اختصار کے ساتھ سرانجام دیا جائے۔ اس کے لیے سوانح نگار کو دشوار گزار مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ اس میں قلمی یا مطبوعہ کاغذات سے حقائق کی چھان بین اور اس کے ماحصل کی ترجمانی کی بصیرت وصلاحیت اور اپنی معلومات کے نتیجے کو خوبصورت شکل دینے کی قابلیت ہونی چاہئے۔ سوانح نگار کو محض خارجی افعال کی وقائع نگاری کے بجائے اندرونی فطرت کی مرقع کشی پر عمل پیرا ہونا چاہئے۔ اسے ہیرو کے افعال اور اس کی اصلیت وحقیقت کے درمیان رشتے کو بھی واضح کرنا چاہئے۔ سوانح عمری سوانح نگار کے تصور کی اسی طرح نمائندگی کرتی ہے جس طرح ایک شبیہ نمائندگی کرتی ہے اس تصور کی جو فن کار کو اپنے موضوع میں نظر آتا ہے۔ دراصل یہ سوانح نگار کی ذات ہی ہے جو اپنی تشریح سے سوانح عمری کو زندگی بخشتی ہے اور یہ سوانح نگار کے فن کا اعجاز ہی ہے جو اسے ایک دلآویز شکل عطا کرتا ہے۔

سوانح نگاری ایک ذہنی فن ہے لہٰذا اس کی ترتیب میں سوانح نگار کو جذبات سے بالکل کام نہیں لینا چاہئے۔ جب کوئی بھی جذبہ ذہن پر اثر انداز ہوتا ہے تو وہ جذبہ چاہے احترام کی شکل میں ہو یا شفقت کی، اخلاقی خواہشات کی یا مذہبی ایقان کی، سوانح نگاری کو ختم کر دیتا ہے۔ ڈاکٹر عبدالقیوم لکھتے ہیں:۔

"فنی اعتبار سے یک رخی اور یک طرفہ سوانح یا مداحی خواہ وہ کتنی
ہی مدلل اور مربوط کیوں نہ ہو، بے جان سوانح ہے۔ عقیدت

---

[1] ڈاکٹر امیر اللہ خان شاہین۔ فن سوانح نگاری اور دیگر مضامین، دہلی ۱۹۷۳ء، ص۔ ۱۴۱

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

> مندی، فنی اعتبار سے سوانح کے لیے سب سے زیادہ مہلک چیز ہے۔ اگر چہ عقیدت کے اس جذبے میں عزت واحترام کا جذبہ پوشیدہ ہوتا ہے لیکن احترام کے یہ معنی نہیں کہ حقائق سے آنکھیں بند کر لی جائیں۔۱"

اس طرح سوانح نگار کو ہیرو کے تئیں غیر جانبدار اور بے باک ہونا چاہیے لیکن انسانی فطرت کا تقاضا ہے کہ وہ موضوع کے انتخاب کے وقت اس کے ساتھ خود کے مزاج کی ہم آہنگی کا بھی خیال رکھنا چاہتا ہے چنانچہ موضوع کے ساتھ اس کی عقیدت، ہمدردی، اس کی طرف جھکاؤ خود بخود ہو جاتا ہے۔ درحقیقت سیرت نگار اپنے خیال میں صداقت اور حقیقت سے کام لیتا ہے لیکن ہم ایک ہی شخصیت کے دو سوانح نگاروں میں بڑا اختلاف دیکھتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ انھوں نے اپنی ہمدردی، چھان بین اور خلوص کے اظہار میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔ دونوں نے اپنے خیال میں حقیقت کو پیش کیا ہے اور صداقت دونوں کے پیش نظر رہی ہے لیکن شدید اختلاف بھی دیکھنے میں آتا ہے۔ سید احتشام حسین اس کی وجہ پر کچھ یوں اظہار رائے کرتے ہیں:۔

> "ہر شخص کی زندگی میں ایک مرکز ہوتا ہے، ایک شاہراہ ہوتی ہے اور باوجود شخصیت کے مختلف مظاہر کے وہ ایک ہی شخص رہتا ہے۔ سیرت نگار اس عنصر کو تلاش کرنا چاہتا ہے۔ وہ اپنے ہیرو کا دل ڈھونڈنا چاہتا ہے۔ کسی کے دل کا پانا زندگی میں دشوار ہے اور مرنے کے بعد تو اکثر اور دشوار ہو جاتا ہے۔ اس طرح کبھی کبھی سیرت نگار جھنجھلا کر اس فرد کی تصویر اپنے آئینے میں دیکھنے لگتا ہے اور نتیجہ میں ہمیں اچھی کتاب مل جائے تو مل جائے لیکن اچھی سیرت یا سوانح عمری مشکل سے ملتی ہے۔۲"

فن سوانح نگاری میں موضوع اور مواد کے بعد اسلوب یا طرز نگارش کو بنیادی

---

۱ ڈاکٹر فرمان فتح پوری۔ (مرتب) اردو نثر کا فنی ارتقا، دہلی ۱۹۹۷ء، ص ۳۲۴

۲ احتشام حسین۔ تنقیدی جائزے، لکھنؤ ۱۹۵۶ء، ص ۴۷۔۱۴۶

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

اہمیت حاصل ہے۔ دوسری اصناف ادب کی طرح سوانح کا بھی اپنا ایک اسلوب ہے۔ اسلوب میں خود شخصیت جلوہ گر ہوتی ہے اور سوانح نگار کی ذات وصلاحیت کا بھی اظہار ہوتا ہے۔ مواد کی فراہمی کے بعد اس کو سلیقے سے پیش کرنا ہی اصل فن ہے۔ بڑی سے بڑی شخصیت وافر مواد کے باوجود سوانح نگار کی کوتاہ قلمی یا طرز ادا کی بدسلیقگی کی بنا پر مجروح ہو سکتی ہے۔

سوانح نگاری کا اسلوب تاریخ اور ناول سے مختلف ہے۔ اس میں نہ تاریخی خشکی کی ضرورت ہے اور نہ ہی ناول و ڈرامے کی طرح تخیلاتی و حسیاتی رنگ کی یعنی تحریر پر تخیل کا گمان نہ ہو۔ حقیقتیں تصور میں گم نہ ہو جائیں۔ اسلوب میں اندھی عقیدت کی موجودگی سوانح نگاری کے لیے سم قاتل ہے۔ قاری کو اس سے جانبداری کا احساس بھی نہیں ہونا چاہیئے۔ سوانح نگار کے قلم میں تازگی و شگفتہ بیانی ہونی چاہیئے۔ اردو میں شبلی کی سوانح نگاری کا خاص وصف ان کا اسلوب ہی ہے جس کے ذریعے وہ دوسرے نقائص فن کو مات دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اسلوب جہاں شگفتہ و شاداب ہو وہیں حفظ مراتب کا پورا پورا خیال لیئے ہوئے ہو۔ ایسا محسوس نہ ہو کہ اسلوب کے بل پر شخصیت کو ابھارا جا رہا ہے۔ اگر ایسا ہوا تو ہیرو اور سوانح نگار دونوں کی شخصیتیں مجروح ہونگیں۔ دراصل اسلوب میں ادب کی ضرورت ہے اور شخصیت کے مقام و منزلت کا شعور بھی۔

اسٹریچی کے نزدیک ادبیت کو فوقیت حاصل ہے۔ ناول اور سوانح میں فرق یہ ہے کہ ناول کے کردار فرضی اور سوانح کے حقیقی ہوتے ہیں۔ مشہور فرانسیسی سوانح نگار آندرے موروا نے اپنی ابتدائی سوانح عمریوں میں رومانی فضا پیدا کی لیکن اس کے یہاں یہ فرق نہیں ملحوظ رکھا گیا کہ ایک سوانح کو تاریخی ناول نہیں ہونا چاہیے۔ اسٹریچی کا دیباچہ جدید سوانح نگاری کا منشور ہے جس میں اس نے ایجاز و اختصار، حسن انتخاب، آزادئ خیال، اظہار حقیقت، غیر جانبداری، بے تعصبی اور متعلقہ واقعات کی ترتیب

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

مناسب اور غیر جذباتی انداز کے ساتھ پیش کرنے پر زور دیا ہے۔

John A. Garraty نے اپنی کتاب "Nature of Biography" میں ناول نگار کے متعلق ناول اور سوانح عمری کے فرق کو واضح کرتے ہوئے لکھا ہے :۔

"ناول نگاروں کی کامیابی کا راز بے لگام تصور پر قائم ہے۔ وہ ہر پیچیدہ کردار کی تخلیق کر سکتا ہے لیکن یہ کردار اس کردار کے مقابلے میں زیادہ پیچیدہ نہیں ہو سکتا ہے جو اسے بنانا چاہتا ہے[1]"

یہ تخیل کی پرواز ہی ہے جس کی بنا پر ناول اپنا اثر دکھاتا ہے۔ ناول نگار کرداروں کے ساتھ جذبے کی آمیزش بھی کر دیتا ہے جبکہ سوانح نگار کو فنی لحاظ سے اس کی اجازت نہیں ہوتی۔ یہ صحیح ہے کہ سوانح نگار کو اپنے موضوع سے محبت یا نفرت ہو سکتی ہے لیکن اس کے باوجود وہ غیر جانبداری کے ساتھ ہیرو کی زندگی کو پرکھتا ہے اور ادبی سانچے میں ڈھال کر اسے پیش کرتا ہے۔ مارکٹ شوٹ جس نے چوسر اور شیکسپیئر جیسے افراد کی سوانح عمریاں مرتب کی ہیں ایک جگہ لکھتا ہے :۔

"جب تک کسی کھیل کو قوانین کے مطابق نہ کھیلا جائے اس میں کوئی مزا نہیں ہے۔ کسی بھی سوانح نگار کے لیے بنیادی شرط یہ ہے کہ وہ سچ کہہ ڈالنے کی ضرور کوشش کرے[2]"

موجودہ دور میں خودنوشت سوانح عمری کی ترقی کو دیکھتے ہوئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سوانح عمری اور خودنوشت سوانح عمری کا فرق واضح کیا جائے۔ خودنوشت یا آپ بیتی کی مقبولیت بھی سوانح عمری سے کم نہیں رہی ہے۔ اس کی مختلف تعریفیں پیش کی گئی ہیں لیکن ابھی تک کوئی جامع اور معتبر تعریف سامنے نہیں آئی ہے۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانکا میں اس کی تعریف کچھ اس طرح ملتی ہے :۔

"خودنوشت سوانح نگاری کا سوانح نگاری سے بہت قریبی تعلق

---

[1] ممتاز فاخرہ۔ اردو میں سوانح نگاری کا ارتقا، دہلی ۱۹۸۴ء، ص ۳۸۔۳۷

[2] ممتاز فاخرہ۔ اردو میں سوانح نگاری کا ارتقا، دہلی ۱۹۸۴ء، ص ۳۲

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

ہے یا یہ کہ خودنوشت سوانح نگاری سوانحی ادب کی ایک خاص شکل ہے۔ یہ (خودنوشت) ایک شخص کے حالات زندگی پر مشتمل ہوتی ہے جو اس نے خود قلم بند کئے ہوں۔ اس لیے یہ پوری نہیں ہوتی ہے[1]"

مذکورہ بالا تعریف کے مطابق خودنوشت سوانح نگاری کا تعلق سوانح نگاری سے بہت گہرا ہے۔ خودنوشت میں سوانح نگار کی حیثیت ہیرو کی ہوتی ہے۔ سوانح نگاری کے دائرے میں شامل ہونے کے باوجود یہ اپنا آزاد، منفرد اور ممتاز مقام رکھتی ہے لیکن تاریخی اعتبار سے پہلے سوانح نگاری کا فن بام عروج تک پہونچا اور خودنوشت سوانح نگاری کا فن اس کے سایے میں پروان چڑھا اس لیے مؤخر الذکر پر اول الذکر کے گہرے اثرات ہیں۔ خودنوشت کے اصول اور ضابطے سوانح نگاری سے ماخوذ ہیں لیکن خودنوشت کے مصنف کا انداز جداگانہ ہوتا ہے۔ اس کا قلم اپنے جذبات و احساسات اور مشاہدات کو عوام تک پہونچانے میں بے باک اور آزاد ہوتا ہے۔ وہ خود ہی اپنی ذات کا محور ہے، خود ہی نظر ہے اور خود ہی آئینہ۔ اور اس آئینے میں اپنی زندگی کے تجربوں، مشاہدوں اور ان سے پیدا ہونے والی نفسیاتی کیفیات کا ناظر بھی ہے۔ خودنوشت کا مصنف خود اپنے قلم سے واقعات کو تحریر کرتا ہے اس لیے وہ خود اپنی زندگی کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالتا ہے۔ اپنے قلم سے دوسروں کو اپنے تجربوں میں شریک کرتا ہے اور اپنی کہانی سناتا ہے جب کہ سوانح حیات میں ہیرو کے فراہم شدہ واقعات اور حالات کو مرتب کیا جاتا ہے۔

روزنامچوں، یادداشتوں، مکاتیب اور سفرناموں وغیرہ کا شمار خودنوشت سوانح عمری کے خام مواد کی حیثیت سے ہوتا ہے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ خودنوشت سوانح عمری میں جذباتی انتشار یا خود پرستی کا اندیشہ بھی ہوتا ہے لیکن یہ قاری کو صاحب سوانح کے باطنی اسرار و رموز سے واقف کرانے میں مددگار ثابت ہوتی ہے۔ یہ ایک آئینہ ہے جس میں قاری صاحب سوانح کی شخصیت کے خط و خال کا عکس دیکھ سکتا ہے۔

---

[1] وہاج الدین علوی۔ اردو خودنوشت فن و تجزیہ، دہلی ۱۹۸۹ء، ص ۳۲

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

شرط یہ ہے کہ ہیرو اپنے ذاتی حالات کو بلا کم و کاست پیش کرے ورنہ واقعات اور کارناموں میں مبالغہ آرائی آپ بیتی کو افسانہ بنا دے گی۔

مختصر یہ کہ فن سوانح نگاری ایک شعوری مگر تخلیقی عمل ہے۔ سوانح نگار کو موضوع کا انتخاب کرنا پڑتا ہے۔ اس کے حدود کا تعین کرنا پڑتا ہے۔ واقعات کو فراہم کرنا اور انھیں سچائی کی کسوٹی پر کسنا پڑتا ہے۔ یہ سارے مراحل ہیں جن سے سوانح نگار کو گذرنا پڑتا ہے۔ خام مواد کی جستجو سے لے کر اس کو منظم انداز میں پیش کرنے تک تخلیقی عمل کا ایک طویل سلسلہ ہے جس سے سوانح نگار کو عہدہ برآ ہونا پڑتا ہے۔ وہاج الدین علوی فن سوانح پر روشنی ڈالتے ہوئے بڑے جامع الفاظ میں لکھتے ہیں:۔

> ''سوانح نگار کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنے مرکز سوانح نگاری کے ہر معمولی سے معمولی مگر نتیجہ خیز عمل کو اس کی شخصیت اور سیرت کے بڑے مرقع میں سجا کر پیش کرے۔ سوانح نگار کا کام واقعہ کو من وعن پیش کرنے سے ختم نہیں ہوتا بلکہ اسے ایک ایسی بصیرت سے کام لینا پڑتا ہے جسے ہم فن کارانہ بصیرت کا نام دے سکتے ہیں جس سے انسانی زندگی کی گوناگوں کیفیات کی فن کارانہ ترجمانی ہو سکتی ہے۔ مختصراً کہا جا سکتا ہے کہ سوانح حیات ادب کی وہ صنف ہے جو کسی خاص فرد کی زندگی کا عکس پیدائش سے موت تک پیش کرتی ہے۔ اس کی تمام تر کامیابیوں اور ناکامیوں نیز اس کی زندگی کے اہم واقعات اور نفسیاتی کیفیات کو دلچسپ ادبی انداز میں اُجاگر کرتی ہے[1]''

★★

---

[1] وہاج الدین علوی۔ اردو خودنوشت فن و تجزیہ، دہلی ۱۹۸۹ء، ص ۳۰

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

باب دوم

سوانح نگاری کا ارتقاء- حالی کے عہد تک

اُردو سوانح نگاری کا پس منظر عربی اور فارسی سوانحی تصانیف میں ملتا ہے۔ چنانچہ عربی اور فارسی سوانح نگاری کا تذکرہ نامناسب نہیں ہوگا۔ قبل اسلام کی مشہور تصنیف ''الاکلیل'' کے سوانحی موضوع بادشاہوں تک محدود ہیں لیکن اسلامی دور کی سوانحی تصنیفوں میں موضوع کے انتخاب میں کوئی پابندی نہیں ہے۔ اس کے باجود سوانح نگاری کے پیچھے جو جذبہ کارفرماں ہوتا تھا وہ مذہب اور بانی مذہب سے متعلق تھا۔ قرآنی احکام کی وضاحت کے لئے احادیث اور سیر یا مغازی کی تدوین کی ضرورت ہوتی تھی اور ان کی صحت کے پیش نظر راویوں کے کردار کی جانچ پرکھ ہوتی تھی۔ ایسا پیغمبر اسلام کے عہد میں شروع ہو چکا تھا۔ خلفاء نے اسے مزید ترقی دی۔ حضرت عمرؓ نے اس ضمن میں خاص توجہ دی۔ انہوں نے حکم دیا کہ غزوات نبوی کا خاص حلقۂ درس قائم کیا جائے۔ اس زمانے میں امام زہری نے مغازی پر ایک مستقل کتاب لکھی جس کی وجہ سے سیرت کا عام مذاق پیدا ہو گیا۔ بعض خاص اصول و معیار بھی مقرر کیے گئے۔ اس دور میں تاریخ نویسی اور سیرت نگاری دونوں ہی میں چھان بین اور تلاش و تفحص کا رجحان بھی نمایاں ہوا۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ فنِ سیرت و مغازی و رجال، علم حدیث کی تدوین کی کوشش کا نتیجہ ہیں اور ایک ہی سلسلہ سے تعلق رکھتے ہیں لیکن حدیثوں کی تنقیح سیرت کے مقابلے میں زیادہ اعلیٰ معیار رکھتی تھی۔

سید شاہ علی نے ان مصنفوں کو جنہوں نے سیرت کی تدوین میں توجہ کی، تین

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

طبقات میں تقسیم کیا ہے جو مندرجہ ذیل ہیں[1]

۱۔ اصحاب مغازی جن میں سے بہت کم جمع و ترتیب روایات میں محتاط تھے۔ ان میں شرحبیل بن سعد، امام زہری، ہشام بن عروہ اور ابن الاثیر قابل ذکر ہیں۔

۲۔ محدثین کرام جو روایات کو مسانید کے انداز پر لکھنے کے باوجود صحابہ کے حال میں جرح و تنقید کو بھول گئے۔

۳۔ حکما، اہل حدیث جن میں فقہا، حکما، رجال و علل شامل ہیں اور جو مسند، ابواب، تاریخ اور کنی پر طبع آزمائی کرتے رہے۔ ان میں امام شعبی، مالک و بخاری وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

بہر حال عربی زبان کی زیادہ قابل اعتماد سوانح عمریاں وہ ہیں جو سیرت رسولؐ پر لکھنے والوں کے انداز سے متاثر ہوئیں۔ رسولؐ کے سیرت نگار ایک طرف تفصیلی جزئیات قلم بند کرتے تھے تو دوسری طرف روایتوں کی صحت کا پورا پورا خیال رکھتے تھے۔ اس سلسلے میں خود راوی کے حالات و کردار کا جائزہ بھی لیتے تھے۔ ان کے ماسوا خلفا، وزرا، سفیروں اور فوجی افسروں کے حالات بھی لکھے گئے ہیں لیکن ان سب کی بنیاد محض روایت پر ہے۔ شعرا، ادبا، کی سوانح عمریوں پر بہت کم توجہ دی گئی۔ شاعروں کے حالات میں قتیبی کی ''الشعر والشعرا'' اردو شاعروں و موسیقاروں کے حالات میں ابوالفرج الاصفہانی کی کتاب ''الآغانی'' اور آٹھویں صدی ہجری کے شاعروں کی سوانح عمریوں کے لئے ''الدرالکامس فی الشعرا''، ''القرآن الثامن'' وغیرہ کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔ تاہم سوانح عمریوں میں اعلیٰ سوانح عمری کے بہت سے عناصر پائے جاتے ہیں۔ ان میں سے ایک عنصر نجی جزئیات کی فراہمی ہے۔ یہاں بھی سیرت رسول کے انداز نے بڑا فائدہ پہونچایا۔ آنحضرت کی زندگی کے عام حالات اور اندرون خانہ کی ہر ہر بات کتابوں میں موجود ہے۔ اس سے وہ حجاب دور ہو جاتا ہے جو عظیم شخصیات کے خلوت و جلوت کے درمیان حائل رہتا ہے۔ تقریباً چار صدیوں تک سوانح عمری کا یہ تصور عربی ادب پر چھایا رہا۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ ملوکیت کے اثر

[1] ڈاکٹر عبدالقیوم۔ حالی کی نثر نگاری، لاہور ۱۹۶۴ء، ص ۱۰۰

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

سے انسان کی زندگی کے دو دائرے جلوت و خلوت مقرر ہوتے گئے۔ اسی طرح عام انسان اور بادشاہ دو الگ قسم کی مخلوق قرار پائیں۔ اس لئے انسان اور انسانیت سوانح عمری کے موضوع سے خارج ہوتے گئے۔ ایسا کس طرح ہوا، ڈاکٹر عبدالقیوم لکھتے ہیں:

> ''مگر تاتاریوں کے حملوں اور اندرونی خرابیوں کے پیدا ہو جانے کے باعث علوم و فنون کی روح مردہ ہوگئی اور عجمی تمدن کے اتصال سے تکلف اور تصنع نے غلبہ حاصل کرنا شروع کیا چنانچہ اب اصلیت کے بجائے بے جا مدح سرائی اور بے باکی کی جگہ خوشامد اور تصنع نے لے لی۔ پھر درباداری کی رسم نے اس رنگ کو اور زیادہ شوخ کر دیا۔[1]''

جہاں تک فارسی سوانح نگاری کا تعلق ہے تو اس پر عربی کے اثرات نمودار ہوئے۔ قبل اسلام فارسی تراجم اور تذکروں کے موضوعات بادشاہوں اور ان کے درباروں تک خاص تھے جنہیں میر الملوک اور آداب الملوک کہا جاتا تھا۔ جب اسلام آیا تو عربی کے اثر نے ان کے موضوعات میں وسعت پیدا کی حتی کہ مواد اور اصول و ضوابط بھی عربی کے مثل ہو گئے۔ فارسی میں بھی متعدد سیر رجال یا فقہی سوانح عمریاں لکھی گئیں یا عربی سے ترجمے کی شکل میں آئیں۔ عربی قرآن کی زبان ہونے کے وجہ سے اکثر فقہی تصانیف کی زبان بھی رہی لیکن جب عہد صفوی میں شیعہ فقہ نقطۂ عروج پر تھی تو ایسی تصانیف خصوصاً فارسی زبان میں لکھی گئیں۔ جن ابتدائی کتابوں میں سوانحی مواد ملتا ہے ان میں محمد ابن طوسی (وفات ۱۰۲۷ء) کی فہرست شوکت الطائفۃ، شیخ احمد کی اسماء الرجال، محمد بن علی کی معالم العلماء، حسن بن یوسف کی ایضاح اشتباہ، روضۃ الجنۃ، قصص العلماء اور کشف المحجوب وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ایرانی مصنفین نے اکثر مخصوص انسانی طبقوں یا جماعتوں مثلاً وزرا، اطباء، شعراء وغیرہ کے تذکرے لکھے ہیں یا تاریخی واقعات کو بالترتیب سنہ وار ذکر کیا ہے۔ قصص الانبیاء ۱۹۷۳ء میں لکھی گئی جس میں ڈیڑھ سو شیعہ علماء کے حالات ملتے ہیں۔ خود نوشتہ فارسی سوانح عمریوں میں سب سے اہم

---

[1] ڈاکٹر عبدالقیوم۔ حالی کی نثر نگاری، لاہور۔ ۱۹۶۴ء۔ ص ۱۰۰

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

اور قابل ذکر شیخ علی حزین کی آپ بیتی ہے۔ اس میں ۱۷۲۲ء میں اصفہان پر افغانی حملے کے چشم دید حالات کا بیان ہے۔

فارسی شعراء کے تذکروں میں ان کی سوانح عمریاں اور ان کے کلام کا انتخاب ملتا ہے۔ یہاں یہ ذکر کرتے چلیں کہ تذکرہ نگاری کی روایت ہمیں عربی زبان ہی سے ملتی ہے اور اس زبان کا سب سے پہلا تذکرہ ابن سلام نے ''طبقات الشعراء'' کے نام سے لکھا تھا۔ اس میں شعرائے جاہلیت و اسلام کے علیحدہ علیحدہ طبقات قائم کر کے ان کے حالات اور کلام کے نمونے درج کیے گئے ہیں۔ تاریخ بتاتی ہے کہ اہل ایران مشرف بہ اسلام ہونے کے بعد نہایت سرگرمی سے زبان و ادب اور علوم و فنون کے میدان میں عربوں سے بازی لے جانے کی کوشش میں مصروف تھے اور ایران و عرب کی ادبیات میں ایک نہ ختم ہونے والا رشتہ قائم ہو گیا تھا۔ ابتدائی چند صدیوں کے یہی ادبی و ثقافتی روابط فارسی میں تذکرہ نگاری کے آغاز کا سبب بنے۔

اکثر تذکروں میں کلام کا انتخاب زیادہ اور شعراء کے حالات برائے نام ملتے ہیں البتہ ان میں فارسی ادب کی تاریخ کا مواد کثرت سے ملتا ہے۔ آگے چل کر ہم دیکھیں گے کہ اردو تذکروں میں بھی بعد میں یہی خصوصیات ملتی ہیں اور اردو تذکرہ نگاری کے ذکر کے ذیل میں ہی ہم تذکروں کی سوانحی اہمیت بیان کریں گے۔ سید شاہ علی ان تذکروں کی تقسیم دو حصوں میں کرتے ہیں[1]

(۱) عام تذکرے: جن میں آغاز سے تذکرہ نویس کے عہد تک کے حالات ہوتے ہیں۔ (۲) خاص تذکرے جن میں صرف کسی مخصوص دور کے شاعروں کا حال ہوتا ہے۔ اول الذکر قسم میں تین صورتیں پائی جاتی ہیں۔ (۱) تاریخی ترتیب کے لحاظ سے یعنی مختلف تاریخی ادوار، حکمرانوں یا خاندانوں کے لحاظ سے شعراء کے حالات کا بیان یا (۲) تخلص کے لحاظ سے ترتیب یا ہر ایک حرف کے تحت تاریخی ترتیب یا (۳) جغرافیائی لحاظ سے مثلاً اقلیموں، ملکوں اور شہروں کے لحاظ سے شعراء کی پیدائش یا قیام کے لحاظ سے یا پیشہ یا مشغلے کے لحاظ سے ترتیب (مثلاً حکمرانوں، شہزادوں، وزیروں، عمائد، عہدہ داروں،

---

[1] سید شاہ علی۔ اردو میں سوانح نگاری، کراچی ۱۹۶۱ء، ص ۱۰۸

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

ائمہ، فضلا، خوش نویسوں، ظریفوں وغیرہ کے) شاعروں کی سوانح عمریاں خصوصاً متاخر زمانہ سے جب کہ سام مرزا بن شاہ اسمٰعیل نے تحفہ سامی لکھ کر اس کو رواج دیا۔

فارسی میں تذکرہ نگاری کی ابتدا سید الدین محمد بن عوفی کے "لباب الالباب" سے ہوتی ہے۔ اس تذکرے کی ترتیب ۶۱۸ھ (۱۲۲۱ء) کے قریب عمل میں آئی۔ یہ تین سو شاعروں کے ذکر پر مشتمل ہے اور دو جلدوں میں منقسم ہے۔ ان دونوں جلدوں میں بارہ ابواب ہیں جن میں شروع کے چار ابواب فن شعر کے بارے میں علمی و تاریخی بحث سے متعلق ہیں۔ بعد کے ابواب میں شعراء کو ان کی سماجی حیثیت شعر و شاعری سے شغف کی نوعیت اور زمانی و مکانی اختلاف کی بنیادوں پر مختلف عنوانات اور فصلوں کے تحت علیحدہ علیحدہ جگہ دی گئی ہے۔

معلوم ذرائع کے مطابق فارسی کے "لباب الالباب" کی ترتیب کے تقریباً پونے تین سو سال بعد تک کوئی تذکرہ نہیں لکھا جا سکا۔ اس سلسلے کی دوسری کڑی دولت شاہ سمرقندی کا "تذکرۃ الشعراء" ہے جو ۸۹۲ھ (۱۴۸۷ء) کے قریب مکمل ہوا۔ یہ تذکرہ دیباچے اور خاتمے کے علاوہ سات طبقات پر مشتمل ہے۔ ہر طبقے کے ذیل میں کم و بیش بیس۔ بیس شاعروں اور ان کے سرپرست امراء و سلاطین کا ذکر ہے۔ اس کے بعد شعراء اردو کے پہلے تذکرے کی ترتیب (۱۱۶۵ھ) سے قبل تک تقریباً پونے تین سو سال کی درمیانی مدت میں شعراء فارسی کے تقریباً چالیس تذکرے معرض وجود میں آ چکے تھے۔ ان میں غالب تعداد ان تذکروں کی ہے جو ہندوستان میں لکھے گئے۔ اسلئے جہاں برصغیر ہند و پاک کو یہ فخر حاصل ہے کہ فارسی زبان کے شاعروں کا پہلا تذکرہ اس کی سرزمین پر مرتب ہوا وہیں یہ امتیاز بھی اس کے حصے میں آیا ہے کہ تذکرہ نویسی کی ترقی میں یہاں کے اہل قلم کی کوششیں ہر دور میں ایرانی ادیبوں کی کاوشوں سے افضل رہی ہیں۔ ہندوستان میں مرتب ہونے والے فارسی تذکروں سے اردو تذکرہ نویسی کے آغاز و ارتقاء کی داستان براہ راست وابستہ ہے۔

مشاہیر سلف کی سوانح عمریوں میں جو تصنیفات فارسی میں ملتی ہیں ان میں سے چند یہ ہیں:۔ انیس الارواح از خواجہ معین الدین چشتی متوفی ۶۳۲ھ جو انہوں

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

نے اپنے مرشد عثمان ہارونی کے حالات میں لکھی، انیس الطالبین از محمد صلاح الدین بخاری جو شیخ بہاء الدین نقش بندی کے حال میں ہے۔ نعمۃ الشمس جو شمس الدین اور شاہ نعمت اللہ کے حالات میں لکھی گئی۔ تغلق نامہ اور تاریخ فیروز شاہی جن سے محمد تغلق اور فیروز شاہ کے حالات کے وضاحت ہوتی ہے۔

ان کے علاوہ بعض ایسی کتابیں جو ہندوستان کے مسلم فاتحوں اور فرماں رواؤں سے متعلق لکھی گئیں ان میں توزک تیموری، توزک بابری، ہمایوں نامہ از گلبدن بیگم، توزک جہانگیری وغیرہ اہمیت رکھتی ہیں۔ ان کتابوں میں بڑی صاف گوئی اور فراخ دلی کا اظہار پایا جاتا ہے۔ البتہ ان کا شمار کسی باقاعدہ صنف کے تحت نہیں کیا جا سکتا کیونکہ ان میں یادداشت، روزنامچے اور آپ بیتی کے مختلف عناصر بہ یک وقت پائے جاتے ہیں۔ قدیم سوانحی کوششوں میں سفینۃ الاولیا، از داراشکوہ (۱۱۵۱ھ) بھی قابل ذکر ہے۔

جب ہم اردو سوانح نگاری کی ابتدا پر غور کرتے ہیں تو سب سے پہلے ہماری نگاہ دکنی ادب پر جاتی ہے۔ یہ دکن ہی ہے جہاں اُردو آریائی اصل کے باوجود اپنے سرچشمے سے دور نامواقف نامانوس فضا میں پلی بڑھی اور جوان ہوئی۔ اُردو ادب کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ ہندوستان کے مخصوص معاشرتی، اقتصادی، اور سیاسی حالات کی بنا پر اردو نظم نے پہلے ترقی کی اور نثر کی ترقی رکی رہی کیونکہ ادبی نثر کے عروج کے لئے ایک مخصوص قسم کی فضا اور سماجی کشمکش کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی لئے جس وقت اردو سودا، میر اور غالب جیسے مستند شاعر پیدا کر چکی تھی، اُردو نثر میں وجہی کی ''سب رس'' انشاء کی ''رانی کیتکی کی کہانی'' سرور کی ''فسانہ عجائب'' اور فورٹ ولیم کالج کی ابتدائی نثری کوششوں کے سوا کچھ اور قابل ذکر نہ تھا۔ یہاں تک کہ احتشام حسین یہ حقیقت بھی ہم پر آشکار کر دیتے ہیں کہ

> ''اُردو نثر کی ترقی میں اتنا عرصہ لگا کہ آج بھی ہم نثر نگاری میں اس منزل پر نہیں پہونچے ہیں جہاں نظم میں ایک صدی پہلے پہونچ چکے تھے۔ یہ بات صرف تعداد اور مقدار کے لحاظ سے نہیں بلکہ معیار اور خصوصیات کے لحاظ سے بھی دیکھی جا سکتی ہے[1]''

---

[1] احتشام حسین۔ تنقیدی جائزے، لکھنؤ۔ ۱۹۵۶ء، ص ۴۰۔۱۳۹

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

مذکورہ اقتباس کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اردو نثر کی ترقی کی رفتار سست ہونے کی وجہ سے سوانح عمری بھی توجہ سے محروم رہی۔ اردو کی نظم و نثر دونوں سلسلے میں دکن کو اولیت حاصل ہے۔ دکن کی ابتدائی شاعری میں منظوم سوانح عمریاں ملتی ہے جو یا تو درباروں میں لکھی گئیں یا مذہبی اثرات کے ماتحت۔ اردو کی پہلی سوانحی تصنیف کے سلسلے میں نقادان فن شبہات کا شکار ہیں۔ اور وہ یقینی طور پر کسی تصنیف کو اردو کی پہلی سوانح عمری نہیں کہہ سکے مثلاً احتشام حسین کا خیال ہے:

> ''یہ بالکل صحیح نہیں بتایا جا سکتا کہ سب سے پہلی کتاب جسے سوانح عمری کہہ سکیں کب اور کہاں لکھی گئی۔ ''مجموعہ قصص'' کے نام سے کتب خانہ انڈیا آفس میں ایک کتاب ہے جس میں نیم تاریخی اور تاریخی واقعات افراد کو مرکز بنا کر لکھے گئے ہیں لیکن جیسا کہ خود اس کتاب کے نام سے ظاہر ہے، لکھنے والے کے پیش نظر ''قصہ پن'' تھا سیرت نگاری وغیرہ نہ تھی۔ اگر فضل کی ''دہ مجلس'' کو امام حسین کی سوانح عمری مان لیں تو پھر ایک کتاب ۱۷۳۲ء کے قریب بھی ہمیں مل جاتی ہے لیکن ظاہر ہے کہ ''روضۃ الشہداء'' میں جس سے یہ کتاب ماخوذ ہے امام حسین کی سیرت سے زیادہ واقعات کربلا کو مجموعی حیثیت سے پیش نظر رکھا گیا ہے۔ پھر حیدر بخش حیدری نے ۱۸۱۲ء میں اس کتاب کا خلاصہ ''گل مغفرت'' کے نام سے شائع کیا[1]''

لیکن فیروز کی ''توصیف نامہ'' کو نصیر الدین ہاشمی نے اردو کی سب سے قدیم سوانح عمری قرار دیا ہے۔ دیگر سوانحی تصانیف میں محی الدین نامہ از فضل (۱۰۵۰ھ کے بعد کی تصنیف) غوث نامہ از شاہ حسین ذوقی، محبوب القلوب از باقر آگاہ ۱۲۰۷ھ کے موضوع عبدالقادر جیلانی ہیں۔ اسرار عشق از مومن، فیض عام قدس (۱۱۲۵ھ) مترجمہ شہاب الدین، سید محمد جونپوری بانی فرقۂ مہدویہ کے حال میں ہے۔ ریاض الجناں

---

[1] احتشام حسین۔ تنقیدی جائزے، لکھنؤ۔ ۱۹۵۶ء، ص ۴۰۔۱۵۰

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

(۱۲۰۷ھ) تحفۂ احباب اور جنان السیر از باقر آگاہ کے موضوع، پیغمبر اسلام، خلفائے راشدین، انبیاء، ائمہ، بزرگان دین، اہل بیت، شہدائے کربلا ہیں۔ ابراہیم نامہ (۱۰۱۰ھ) از عبدل، قطب مشتری (۱۰۱۸ھ) از وجہی، علی نامہ (۱۰۶۷ھ سے ۱۰۷۷ھ تک) از نصرتی کے موضوع مختلف شاہان دکن ہیں۔ مؤخرالذکر مثنویاں اردو ادب میں بہت مشہور ہو چکی ہیں۔

دراصل سترھویں صدی عیسوی میں گولکنڈہ اور بیجاپور کی دکنی ریاستوں کے زیر سرپرستی اردو ادب کے اولین لیکن اعلیٰ اور پختہ نقوش ڈالے گئے۔ قلی قطب شاہ، وجہی، نصرتی، غواصی اور ابن نشاطی کے نام اردو ادب میں اسی لئے فراموش نہیں کیا جا سکتے کہ انہوں نے مختلف اصناف ادب پر قلم اٹھا کر اس نومولود زبان کے وسیع اور لامحدود امکانات کی طرف رہنمائی کی۔ خاص طور سے نصرتی کو شخصیت نگاری سے بے حد لگاؤ ہے اور وہ اس فن پر خاصی قدرت رکھتا ہے۔ ''علی نامہ'' میں نصرتی نے علی عادل شاہ کی تخت نشینی مغلوں اور مرہٹوں سے جنگ و پیکار کے مختلف واقعات کا چشم دید تفصیلی، مرتب، مربوط اور مستند بیان کیا ہے۔ میدان جنگ کے نقشوں، فوجوں کی خصوصیتوں، افسروں اور سپاہیوں کے کردار، روزمرہ زندگی کے واقعات، اتم وعزاداری کا بڑا اچھا ذکر ملتا ہے۔ نصرتی کی ''گلشن عشق'' اور امین کی ''بہرام'' اور ''بانو حسن'' میں شاعر کے ذاتی حالات کا بیان بھی ملتا ہے۔ ''گلشن عشق'' میں ''حسب حال خود'' کے تحت نصرتی نے اپنے والد کے اوصاف و عادات، اپنے بچپن کی تعلیم و تربیت اور ذوق شاعری سے لگاؤ کا حال قلم بند کیا ہے۔ مزید اپنی جوانی، شہزادہ علی سے قربت و یگانگت کا حال بیان کیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ اپنے مذہبی عقائد اور ان پر پابندی، اپنے دوستوں کا ذکر بھی شامل کیا ہے۔ اپنے گناہوں کا اعتراف کیا ہے اور یہ فخر بھی کیا ہے کہ باوجود اپنے گناہوں کے وہ مذہبی فرائض کے ادائیگی سے غافل نہیں رہا۔ اس کے کلام سے ہم پر یہ بھی منکشف ہو جاتا ہے کہ وہ اپنی خانگی زندگی سے مطمئن نہیں تھا۔

واضح رہے کہ یہ تصانیف مذہب و اخلاق اور تاریخ و سیاست سے زیادہ متاثر ہیں اور ان کا طریقۂ بیان خالص سوانحی نہیں ہے۔ ان سے صرف اتنا اندازہ کیا جا سکتا ہے

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

کہ اردو کے ابتدائی دور میں کس درجہ سوانح نگاری کے عناصر پائے جاتے ہیں۔ لہٰذا انہیں باقاعدہ سوانح نگاری سے منسوب کرنا فاش غلطی ہوگی۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ گیارھویں صدی ہجری یا سترھویں صدی عیسوی میں اُردو زبان اس قابل ہو چکی تھی کہ وہ شخصیت نگاری اور سوانح نگاری کے مختلف عناصر کو مثنویوں اور دیگر منظوم صورتوں میں سمو دے۔ بارھویں صدی ہجری میں دکن میں ہم کو زیادہ ترتیب یافتہ تصور اور عناصر ملتے ہیں۔

قطب مشتری اور علی نامے میں اپنے بادشاہوں کے حالات کے علاوہ اس زمانے کے تاریخی واقعات و معرکہ جات، روایات اور طرز معاشرت، تہذیب و تمدن کی بھی تفصیل ملتی ہے۔ بعض میں مختلف حالات ملا دئے گئے ہیں۔ مثلاً وجہی نے ''قطب مشتری'' میں اپنے ہم عصر قلی قطب شاہ کو ہیرو بنایا ہے۔ اس میں قلی قطب شاہ اور بھاگ متی کے عشق کا واقعہ استعارۃً درج ہے۔ اس مثنوی سے وجہی کی تعلیم، تربیت، مالی حالت، ہم عصر شاعروں سے چشمک اور کشمکش کا حال بھی کھلتا ہے۔ علی نامہ کی طرح اس میں بھی سوانح عمری اور آپ بیتی دونوں کے عناصر ملتے ہیں۔

ایک اور شاعر ملک خوشنود، محمد قلی قطب کا پروردہ غلام تھا۔ اس کی مثنوی یوسف زلیخا کا کہیں پتہ نہیں چلتا لیکن اس نے مثنوی ''بہشت بہشت'' کے دیباچہ میں اپنا اور اپنی شاعری کا حال لکھا ہے۔ خاور نامہ ایک رزمیہ مثنوی ہے جسے کمال خاں رستمی نے لکھا۔ اس میں حضرت علی کی اپنے عصروں سے جنگوں کا بیان ہے۔ یہ اس نام کی فارسی نظم ''خاور نامۂ ابن حسام'' کا لفظی ترجمہ ہے اور ۱۰۵۹ھ میں خدیجہ سلطان کے حکم پر لکھی گئی تھی۔ بعد کے زمانے کی جو مثنویاں ملتی ہیں ان میں قصہ گوئی پر زیادہ زور ہے۔

اس دور کی مذکورہ دکنی مثنویوں (جن میں سوانحی عناصر موجود ہیں) کے مقابلے میں شمالی ہند میں اس انداز کی نظم و نثر کا کوئی نمونہ نہیں ملتا اور اس میدان میں یکسر سناٹا چھایا ہوا ہے۔ درحقیقت یہ ایک خاص ماحول اور سیاسی ابتری کا نتیجہ ہے۔ ہم تاریخی تفصیل میں جانا نہیں چاہتے لیکن اتنا ضرور عرض کر دیتے ہیں کہ وہ دور بے سکونی اور اضطراب کا دور تھا۔ عیش و عشرت کے ماحول اور آپسی خانہ جنگی سے معاشرہ زوال پذیر ہو رہا تھا۔ چنانچہ اردو کے اہل قلم اور باشعور شخصیتیں ایک سوگوار فضا اور گھٹا ٹوپ

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

اندھیرے میں ٹکر مارتی رہیں۔ ان حالات میں انتشار و بدامنی اس طرح چھائی ہوئی تھی کہ اس کے اندر منظم اور سنجیدہ ادب کا پھلنا پھولنا ممکن ہی نہیں تھا۔ شاعری اور خصوصاً غزل کے دامن میں ادبا نے پناہ لینے کی کوشش کی اور اپنے دلی جذبات کو غزل کی لے میں ٹھنڈا کرنے کی جرأت کی۔ ایسی حالت میں سوانح نگاری جیسی سنجیدہ اور منظم صنف ادب کی باقاعدہ تلاش بیکار معلوم ہوتی ہے۔ سوانح نگاری کے لئے مصنف کا ذہنی انتشار، نفرت یا شدت، سم قاتل کی حیثیت رکھتی ہے۔

البتہ اس دور میں ہمیں چند غیر شعوری کوششیں ضرور ملتی ہیں۔ شمالی ہند میں بھی سوانح نگاری کے نقوش غیر شعوری طور پر مرثیہ گوئی سے ابھرتے ہیں۔ مرثیہ نگاری کی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ ایک میں کربلا کے مخصوص واقعہ کو لے کر متعلقہ افراد کی سیرت و کردار کو صفحۂ قرطاس پر ازسرنو اجاگر کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ دوسری قسم ذاتی مرثیوں کی ہوتی ہے۔ یہ ہم عصروں کی سیرت کے نمایاں خدوخال کو ابھارنے میں کامیاب ہوتے ہیں مثلاً غالب، مومن، شبلی، چکبست، اقبال وغیرہ کے مرثیے۔ ان میں سیرت نگاری، حقیقت پسندی اور نفسیاتی اثر انگیزی زیادہ واضح طور پر نظر آتی ہے۔ اس طرح ان مرثیوں میں سوانحی اجزا تو ضرور کارفرما ہوتے ہیں لیکن انہیں سوانح نگاری کی کسی باقاعدہ صنف میں شمار نہیں کیا جا سکتا۔ مزید یہ کہ سوانح نگاری کے اصول و معیار پر پورا اترنے کے لئے اکثر سوانحی ارادے کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ الطاف فاطمہ لکھتی ہیں:

> ''اس طرح انہیں کتابوں میں سیرت نگاری کی اولین بنیادیں مل جاتی ہیں اور اس طرح ہمارے لکھنے والے غیر شعوری طور پر سوانح نگاری کی داغ بیل ڈالتے جا رہے تھے اور سیرت اور شخصیت نگاری کا وہ بیج جو ابتداء ہی سے اردو کے بنجر زمین میں ڈال دیا گیا اب آہستہ آہستہ اس میں اکھوا پھوٹ رہا تھا بلکہ وہ سر اٹھا رہا تھا[1]''

بعد ازیں اردو تذکرہ نگاری کا دور آتا ہے۔ عربی اور فارسی تذکرہ نگاری کا ذکر

[1] الطاف فاطمہ۔ اردو میں فن سوانح نگاری کا ارتقا، دہلی ۱۹۷۲ء، ص ۹۳

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

آ چکا ہے اور ہم نے یہ بھی اشارہ کر دیا تھا کہ اردو شاعری کی طرح اردو شاعروں کے تذکرے بھی فارسی سے متاثر ہیں۔ بلکہ ان کی زبان بھی اکثر فارسی ہی رہی۔ گرچہ انیسویں صدی کے آغاز اور وسط میں بعض اردو تذکرے ملتے ہیں لیکن ان کی تعداد برائے نام ہے۔ گارساں دتاسی نے ۱۱۳ تذکروں اور بیاضوں کا ذکر کیا ہے۔ ان میں صرف ۶ تذکرے اردو زبان کے ہیں۔ صحیح بات یہ ہے کہ میر کے تذکرۂ نکات الشعرا (۱۷۷۷ء) اور دتاسی کے تذکرے (۱۸۷۷ء) تک چند کو چھوڑ کر اردو تذکرہ نگاری پر فارسی زبان کا غلبہ رہا لیکن زبان کے بدلنے سے موضوع، مواد یا بیان پر کچھ فرق نہیں پڑا۔

ولی دکنی کی وفات ۱۷۰۷ء میں ہوئی۔ دکن اس وقت تک پوری طرح مغلوں کے زیر اقتدار آ چکا تھا اور سیاسی معاشی نظام کی وحدت نے شمال و جنوب کے درمیان تہذیبی لین دین اور ثقافتی ربط و ضبط کے راستے کافی حد تک ہموار کر دیے تھے۔ ولی ۱۷۰۰ء میں دہلی آئے اور کچھ سالوں بعد ان کا دیوان بھی آیا جو شمالی ہند میں اردو شاعری کے لئے فال نیک ثابت ہوا۔ ولی کے کلام کی مقبولیت نے شمالی ہند میں اردو شاعری کے ارتقا کی رفتار پر بڑے خوش آئند اثرات مرتب کئے۔ فارسی کی رونق ختم ہونے لگی کیونکہ اردو ایک طاقت ور حریف کی حیثیت سے اس کے مقابل آ کھڑی ہوئی۔ نتیجتاً متعدد شعرا مثلاً محمد شاکر ناجی، شیخ شرف الدین مضمون، مصطفیٰ خاں یک رنگ، شاہ مبارک آبرو، مرزا مظہر جان جاناں، شاہ حاتم، صدالدین فائز وغیرہ قدر شناس نگاہوں کا مرکز قرار پائے۔ فارسی کی جگہ اردو کو مسند اقتدار پر لے آنے کا یہ رجحان جس تیزی کے ساتھ عوام و خواص میں مقبول ہوا، تاریخ ادب میں اس کی مثال کم ملتی ہے۔

شمالی ہند میں اردو شاعری کو مرکزیت ملنے اور اس کی بنیادیں مستحکم ہونے کے ساتھ دکن کا چراغ گل ہونے لگا۔ یہاں تک کہ ولی کے بعد اس علاقے سے سراج اورنگ آبادی کے علاوہ کوئی بڑا شاعر پیدا نہیں ہوا۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ ولی نے غزل کی صنف کو اپنی تمام تر توجہات کا مرکز بنا کر جس رمز شناسی اور دیدہ وری کا ثبوت دیا تھا اس کا اندازہ دکن والوں کے مقابلے میں شمالی ہند کے لوگوں نے زیادہ بہتر طور پر کیا۔ شمالی اردو شاعری کی تاریخ دراصل غزل کے ارتقاء کی تاریخ ہے اور

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

تذکرہ نگاری کے فن نے تاریخ کے اس وسیع سلسلے کی ایک کڑی کی حیثیت سے ترقی کی ہے۔ تذکروں کے بارے میں سید عبداللہ کا خیال ہے کہ:

> ''تذکروں میں قیمتی سوانحی مواد موجود ہے لیکن وہ بذات خود مکمل سوانح عمری کے قائم مقام نہیں بن سکتے یا تذکرہ سوانح نگاری کے فن کی ایک شاخ ہے جس کو لغت اور سوانح کا مرکب قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس میں حالات و واقعات کچھ زیادہ نہیں ہوتے۔ صرف چیدہ واقعات دے دیئے جاتے ہیں اور سنین کا التزام بھی کم ہوتا ہے۔ تذکرہ افراد کی زندگی کے متعلق بہت کم معلومات پیش کرتا ہے۔ وہ صرف اس اجتماعی جماعتی ذوق کی تشفی کرتا ہے جس کی ہماری تہذیب نے شروع سے پرورش کی ہے[1]''

تذکروں میں کئی خامیوں کا ذکر کیا جاتا ہے جیسے ان میں مشہور مؤلفین اور دوستوں کی مدح سرائی دل کھول کے کی جاتی ہے اور اس طرح تذکرہ نگاروں کو اپنی فصاحت، بلاغت اور انشا پردازی کے جوہر دکھانے کا خوب موقع ملتا ہے۔ وہ عمدہ عمدہ اشعار کا انتخاب کر کے اپنے ذوق سلیم کا اظہار کرتے ہیں۔ گارساں دتاسی نے تذکرہ نگاری کے سلسلے میں ان چیزوں کا ذکر کیا ہے جس کی روشنی میں یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ان تذکروں کی تالیف کا مقصد سوانح نگاری نہ تھا بلکہ تذکرہ نگاروں کے پیش نظر دو باتیں ہوتی تھیں۔ اول اپنی فصاحت، بلاغت اور انشا پردازی کا اظہار۔ دوم یہ کہ شعراء اپنی ہیاضیں رکھتے تھے جن میں ہم عصر شعراء کے نمونہ ہائے کلام کے ساتھ ساتھ اپنی رائے اور پسند کا اظہار بھی کر دیتے تھے اور اس ضمن میں کبھی کبھی ایک دو جملے یا چند سطریں شاعر کی ذات کے متعلق بھی لکھ دیا کرتے تھے۔ ان کا مقصد سیرت نگاری ہرگز نہیں تھا۔

تذکروں میں شاعروں کا انتخاب عظمت، سنجیدگی اور پختگی کے لحاظ سے نہیں کیا جاتا تھا۔ بلکہ ان میں چھوٹے بڑے، سنجیدہ، ہزل گو، موجودہ اور سابق ہر طرح کے شعراء کا ذکر کیا جاتا تھا۔ ان میں سنے سنائے نام بھی شامل کر لئے جاتے تھے۔ موضوع

---

[1] سید عبداللہ۔ میر امن سے عبدالحق تک، دہلی ۱۹۶۵ء، ص ۱۳۶

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

کے انتخاب میں تذکرہ نگاروں نے کسی طرح کے متعین کردہ اصول وضوابط پیش نظر نہیں رکھے بلکہ ہر تذکرہ نگار اپنی ذاتی پسند و ناپسند کے لحاظ سے حالات کو مرتب کرتا تھا۔ کہیں شعراء کا ذکر حروف تہجی کے لحاظ سے اور کہیں ادوار میں انہیں تقسیم کر کے پیش کیا جاتا تھا۔ لیکن تذکروں کے مطالعے سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ عموماً ان کے لکھنے والوں نے اپنے پیش رؤوں کی تقریباً ہر معاملہ میں تقلید کی ہے اور شاذ و نادر ہی اپنی صناعی کا مظاہرہ کیا ہے۔ گرچہ تذکروں میں شعراء کے انتخاب پر اعتراضات وارد کئے گئے ہیں لیکن یہ اعتراضات زیادہ تر ان کے ناموں کی عدم شمولیت پر یا ان کے حالات میں اختصار و تفصیل یا ان پر تنقید و تبصرہ کے ضمن میں ہیں۔ پھر بھی تذکرے کے موضوع کا انتخاب بہت حد تک تذکرہ نگاروں کی مرضی پر منحصر ہوتا تھا۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تذکرہ نگاروں نے تذکروں کے مواد کے سلسلے میں کس چیز پر انحصار کیا۔ دراصل انہیں اس معاملے میں زیادہ تر اپنی معلومات اور سنی سنائی باتوں پر بھروسہ کرنا پڑتا تھا۔ اس زمانے میں نقل و حمل کے مسائل ہونے کی وجہ سے شاعروں کی تصانیف اور دیگر تحریروں کی دستیابی محال تھی اور روزنامچوں کا رواج ہی نہیں تھا اور اگر ہوتا بھی تو اس کے حصول میں اسی طرح دقت آتی جو دیگر تحریروں کے حاصل کرنے میں ہوسکتی تھی۔ کسی کو دوسرے کی زندگی میں دخل انداز ہونے کا حق حاصل نہیں تھا اور نہ ہی اس کو اچھا سمجھا جاتا تھا اس لئے نجی خطوط کو بھی ظاہر نہیں کیا جاتا تھا۔ ان حالات میں جدید قسم کے سوانحی مواد یا خودنوشتہ سوانحی مواد کی توقع بھی نہیں کی جاسکتی تھی۔

تمام کمزوریوں اور خامیوں کے باوجود ان تذکروں میں ایسی بہت سی باتیں مل جاتی ہیں جو ادب و تاریخ کے لئے اہمیت کی حامل ہیں۔ ان کے ذریعہ برسوں پہلے کی تہذیب و تمدن، اقتدار، معاشرت، ماحول کے مشاہدات، ادبی علمی محفلوں، مشاغل و تفریحات، مشاعروں، وضع داریوں، پاسداریوں اور نظام معاشرت کی تصویریں ہماری آنکھوں کے سامنے روشن ہوجاتی ہیں۔ تذکروں پر جو مختلف اعتراضات کئے گئے ہیں ان میں ناانصافی، جانب داری، خودستائی، تحقیق کی کمی، شاعری کے ارتقا کی

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

جھلک کا فقدان وغیرہ کے علاوہ ان کے تاریخ کی شاخ نہ ہونے کے ہیں، ان کے علاوہ ان تذکروں میں اختصار اور جامعیت دونمایاں بیانیہ رجحانات ہیں۔

نکات الشعراء از میر تقی میر اردو کا پہلا تذکرہ خیال کیا جاتا ہے۔ سیرت نگاری کے لحاظ سے یہ اپنے دور کا اہم ترین تذکرہ ہے اور اس میں پیش کئے ہوئے نقائص مختصر ہونے کے باوجود مکمل ترین ہیں۔ یہ تذکرہ ۱۱۶۵ھ میں لکھا گیا اور یہ ۱۰۲ شاعروں کے حالات پر مبنی ہے۔ باوجود اس کے کہ معترضین نے اس پر اختصار، نظر اندازی اور بے اعتنائی کے الزامات لگائے ہیں، اس پر اس کے مقلدین ومخالفین دونوں نے بہت کم اضافہ کیا ہے۔ نکات الشعراء میں اصلاح سخن، تنقید کلام اور تصویر سیرت تینوں عناصر پائے جاتے ہیں۔ سید شاہ علی لکھتے ہیں:

> ''میر پر معاصر تذکرہ نگاروں کے اعتراضات، دکنی شاعروں کی نظر اندازی، بعض اہم شاعروں کے ذکر میں اختصار، ان کے کلام میں اصلاح یا ان کی تنقید میں بے دردی (حالانکہ بعض معمولی شاعروں مثلاً تاباں کا ذکر) وغیرہ پر مشتمل ہیں۔ میر کے دردناک ذاتی حالات اور نفسیات اور ان کی زبان کے معیار اور ان کے منصب کے مدنظر ان اعتراضات کی وقعت کم ہو جاتی ہے[1]''

لیکن اس بات سے بھی چشم پوشی نہیں کی جاسکتی کہ سیرت نگاری کے لئے ایک بنیادی اصول غیر جانبداری اور متوازن اسلوب بیان ہے جو ہمیں میر کے یہاں مفقود نظر آتا ہے۔

تذکرہ شعرائے اردو جو ۱۱۸۸ھ اور ۱۱۹۲ھ کے درمیان لکھا گیا، میر حسن کا ایک متوازن اور معتدل تذکرہ ہے۔ انہوں نے اپنے معترضین کی خوبیوں کی بھی داد دی ہے اور اپنے دادا میر ضاحک کی ہزل گوئی کی بھی مذمت کی ہے۔ اس تذکرہ میں میر حسن نے حالات کی دریافت وتحقیق کے وسیع امکانات کے باوجود شعراء کے تعارف میں سوانحی پہلو کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے صرف سیرت وشخصیت کے بارے میں اظہار

---

[1] سید شاہ علی۔ اردو میں سوانح نگاری، کراچی ۱۹۶۱ء، ص ۱۲۳

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

خیال اور کلام کے متعلق رائے زنی سے سروکار رکھا ہے۔ چنانچہ اس تذکرہ میں شاہ فصیح کے سال وفات کے علاوہ نہ تو کسی واقعے کا سن مذکور ہے اور نہ عام طور پر معلوم ومشہور زبانوں کے سوا کسی شاعر کی داستان حیات سے متعلق کوئی خاص مواد ملتا ہے۔ لیکن میر حسن نے کسی شاعر کے اوصاف ذاتی وصفاتی کی تعریف یا اس کی کوتاہیوں کے بیان میں مبالغہ سے کام نہیں لیا ہے۔ اگر کسی شخص کی ذات میں انہیں کچھ برائیاں نظر آتی ہیں تو ان کی نشان دہی کے ساتھ ہی وہ اس کی خوبیوں کی اعتراف کو بھی ضروری سمجھتے ہیں۔

'گلزار براہیم'' علی ابراہیم خاں خلیل کی تصنیف ہے جس میں تقریباً ۳۲۶ شاعروں کے حالات واشعار ملتے ہیں۔ خلیل نے جن شاعروں پر خصوصی توجہ صرف کی ہے ان کے بارے میں بالعموم ولایت، وطن، جائے سکونت اور سلسلہ معاش وغیرہ سے متعلق ان کی صراحتیں خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ علاوہ ازیں اکثر و بیشتر شعراء کے ذکر میں ان کے حالات کی تخصیص کر کے اور دوسرے اہم واقعات کے سنین متعین کر کے انہوں نے ایک قابل قدر کارنامہ انجام دیا ہے۔ مرزا علی لطف کا تذکرہ گلشن ہند اپنی نوعیت کے اعتبار سے کافی اہم ہے۔ گلکرسٹ کی فرمائش پر لطف نے علی ابراہیم خاں خلیل کے تذکرے ''گلزار ابراہیم'' کو اردو زبان میں منتقل کرنے کی خدمت انجام دی۔ حیدر بخش حیدری کے ''گلشن ہند'' کے بعد شعرائے اردو کا یہ دوسرا تذکرہ ہے جس میں اظہار مطالب کے لئے اردو زبان کو اپنایا گیا ہے۔ لطف کا ''گلشن ہند'' ۱۲۱۵ھ مطابق ۱۸۰۱ء میں مکمل ہوا۔ یہ تذکرہ ترجمے کی شکل میں فورٹ ولیم کالج میں لکھا گیا تھا۔ اس میں خاص توجہ زبان و بیان کی صحت وصفائی پر صرف کی گئی ہے۔ لطف نے بے ضرورت عبارت آرائی کا مظاہرہ بھی کیا ہے اور جا بجا نفس مضمون میں بھی اپنی طرف سے اضافے کئے ہیں لیکن یہ اضافے مفید اور کارآمد ہیں۔ گرچہ واقعات کے بیان میں بعض غلطیاں ہوئی ہیں پھر بھی اس تذکرے میں مفید اور معلومات افزا مواد کافی مقدار میں موجود ہے۔ خصوصاً لکھنؤ، عظیم آباد اور کلکتہ سے متعلق شعراء کے بارے میں ہمیں اس سے بہت سی اہم اور کارآمد باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ اردو ادب کی

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

تاریخ میں اس اعتبار سے بھی اس تذکرے کی اہمیت کم نہ ہوگی کہ یہ وہ پہلی کتاب ہے جس میں تذکرہ نویسی کے فنی تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے اردو شعراء کے تعارف کے لئے اردو زبان استعمال کی گئی ہے۔ الطاف فاطمہ ان کے تذکرہ نویسی میں دلی جذبات کی شمولیت کا ذکر کرنے کے بعد لکھتی ہیں:

> ''غرض کہ ان کے اس نوع کی شخصیت نگاری اور تصویر کشی سے ان کے موضوعات کی زندگی کے مختلف راستے ہمارے سامنے آجاتے ہیں اور اس طرح پہلی مرتبہ اردو میں ہم کو سوانح نگاری کے موضوع کے ساتھ جذبات اور خلوص کا خوشگوار امتزاج نظر آتا ہے۔[1]''

مؤخرالذکر دونوں تذکروں کے مطالعے سے یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ اردو تذکرہ نگاری بھی ان اثرات کو قبول کر رہی تھی جو فورٹ ولیم کالج میں اردو نثر پر پڑ رہے تھے یعنی دوسری اصناف ادب کے علاوہ اردو تذکرہ نگاری کی جڑیں مضبوط اور مستحکم ہوتی جا رہی تھیں اور اس کے لئے تحقیق و تفصیل کے راستے کھلتے جا رہے تھے۔ اب قدیم تذکروں کے نقائص کی اصلاح کی طرف بھی توجہ دی جانے لگی تھی۔ یہاں پہونچ کر الطاف فاطمہ نے بحیثیت مجموعی تذکروں کی تین قسمیں کی ہیں[2]:

۱۔ وہ تذکرے جو تحقیقی اور تاریخی رجحان کے ماتحت لکھے گئے۔

۲۔ زبان اردو کی امکانی تحقیق سے متعلق تذکرے جن میں علاوہ لسانیاتی تحقیق کے مختلف ادوار میں مختلف اصناف سخن کی ترقی کے اسباب اور فن تذکرہ نویسی کی تنقید پر زور دیا گیا ہے۔

۳۔ وہ تذکرے جن کو ادبی تاریخ کے قالب میں ڈھالنے کی کوشش کی گئی ہے اور جن کے رجحانات کے آئینہ دار مولانا محمد حسین آزاد کی ''آب حیات'' ہے۔

ابھی اردو تذکرے ان نئے رجحانات و اثرات کو ڈر ڈر کر اپنا ہی رہے تھے

---

۱ آنسہ الطاف فاطمہ۔ اردو میں فن سوانح نگاری کا ارتقا، دہلی ۱۹۷۴ء، ص ۶۹

۲ آنسہ الطاف فاطمہ۔ اردو میں فن سوانح نگاری کا ارتقا، دہلی ۱۹۷۴ء، ص ۷۰

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

کہ اردو کے مایہ ناز انشا پرداز محمد حسین آزاد کے قلمی جادو نے سارے شبہات کو رفع کر دیا اور ۱۸۸۰ء میں ان کی تصنیف آب حیات نے اعلان کر دیا کہ وہ رجحانات جو اردو تذکروں میں پیدا ہو رہے تھے اب امر مسلم اور مستقل طرز بن چکے ہیں۔ آب حیات نے جو اردو تذکروں کی آخری کڑی ہے، تذکرہ نگاری کی دنیا میں ہلچل پیدا کر دی۔ اس کتاب کو مصنف نے پانچ ادوار میں تقسیم کیا ہے اور ہر دور کے بعض نمائندہ شاعروں پر اپنی ساری توجہ صرف کی ہے۔ ان میں سے بعض کو بعض سے موازنہ کر کے اپنا زور طبع دکھایا ہے۔ پہلے دو دور مختصر ہیں۔ تیسرے دور سے مصنف کا اصل کمال ظاہر ہوتا ہے۔ اس دور میں میر و سودا کو تفصیل سے ذکر کیا ہے اور لطائف و ظرائف کی آرائش کے ساتھ پیش کیا ہے۔ چوتھے دور میں انشا، ناسخ، مصحفی، جرأت، آتش کا بڑا دلچسپ بیان ہے۔ پانچویں دور میں آزاد نے اپنے پوری فن کاری دکھا دی ہے۔ تفصیل کے ساتھ اس میں لطائف و ظرائف کی چاشنی بھی ہے۔ اپنے استاد ذوق کے تفصیلی ذکر میں تقریباً پچاس صفحات صرف کئے ہیں۔ اپنے استاد کی تعریف کو اپنے معاصرین غالب، مومن کے مقابلے میں مبالغہ کے ساتھ بیان کیا ہے۔

آزاد کا سب سے بڑا کارنامہ ان کا طرز اسلوب ہے۔ انہوں نے اپنے شگفتہ اور جان دار طرز بیان کی مدد سے اشخاص کی چلتی پھرتی تصویریں پیش کر دی ہیں۔ ان کے لطائف و ظرائف مزے مزے کی کیفیات پیدا کر دیتے ہیں۔ میر کا استغراق، بلند نظری، قناعت پسندی اور نازک مزاجی، سودا کی معاصرین سے نوک جھونک، مصحفی اور انشا کے معرکے، انشا کی ظرافت اور عبرتناک حالات، ناسخ کی رنگت اور جسامت، ورزش اور پُرخوری، آتش کی نوک جھونک اور قرابتیں، ذوق کی محویت اور غالب کی خوش طبعی وغیرہ کا بیان قاری کو زمان و مکان کی قید سے آزاد کر کے ذکر کئے جا رہے شاعر کی صحبت میں شریک کرا دیتا ہے۔ ان کے تخیل اور انوکھے طرز بیان کے امتزاج نے مرقعوں کو ہمارے سامنے مجسموں کی شکل دے دی ہے۔ لیکن سوانحی اصول کے پیش نظر ہمیں اس میں یہ خامی نظر آتی ہے کہ آزاد نے تصویروں میں رنگ بھرتے بھرتے حقیقت کو افسانے اور تخیل کی دنیا بنا کر رکھ دیا ہے۔ مثلاً میر تقی میر کے حالات اور

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

مزاج کے سلسلے میں ان کا لکھنؤ میں وارد ہوتے ہی مشاعرے میں شرکت کرنا اور پھر اہل لکھنؤ کا ان کی وضع قطع پر جس جس کر ان کی تعریف اور وطنیت کے متعلق استفسار، یہ واقعہ بڑے پر اثر الفاظ میں بیان کیا ہے۔ ساتھ ہی ان کے لباس اور وضع کی ایسی اچھی تفصیل دی ہے کہ میر صاحب اور ان کے زمانے کے لباس کا بڑا واضح تصور ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ لیکن جدید تحقیق کے مطابق یہ واقعہ بے بنیاد ثابت ہوا ہے۔

اگر چہ آب حیات کا بنیادی مقصد تاریخ ادب کو پیش کرنا تھا لیکن اس میں شخصیت نگاری کے عناصر اس درجہ صحت مندانہ صورت میں ملتے ہیں کہ ہم اس کو قدیم وجدید سیرت اور شخصیت نگاری کی مبوری کڑی کہہ سکتے ہیں۔ تذکرہ نگاروں میں آزاد کو پہلی دفعہ اس نقص کا احساس ہوا کہ قدیم سوانحی تصنیفات میں ناموروں کی سرگزشت حقائق کی روشنی میں نہیں لکھی گئی۔ چنانچہ آزاد نے اس خامی کو دور کرنے کی کوشش کی حالانکہ وہ خود بھی تخیل آفرینی کا شکار ہوئے ہیں۔

غرض یہ کہ محمد حسین آزاد نے تمام شعراء کے حالات زندگی اور مرقعوں کو کچھ تو اپنی معلومات کے سہارے اور کچھ اپنے زور قلم اور تخیل کے بھروسے پر بڑے دل نشین اور تفصیلی پیرائے میں پیش کیا ہے۔ یہاں یہ بات واضح رہنی چاہیئے کہ ''آب حیات'' نہ تو سوانح نگارانہ مقاصد کے پیش نظر لکھی گئی تھی اور نہ ہی ہم اسے سوانح میں شمار کر سکتے ہیں پھر بھی اس میں جو کچھ ہے اس کی بدولت ہم اسے قدیم وجدید طرز سوانح نگاری کی درمیانی کڑی کہہ سکتے ہیں۔

تذکروں کے علاوہ اس دور میں ہمیں متعدد ایسی تصنیفات ملتی ہیں جن میں سوانحی عناصر یا جزئیات کارفرما ہیں مگر انہیں سوانح کا نام نہیں دیا جا سکتا ہے مثلاً مجالس رنگین از سعادت یار خاں رنگین، ترجمۂ تاریخ الخلفاء، ضیاء الابصار، دوازدہ مجلس، سیرت رسول مقبول، تذکرۃ الکاملین، روضۃ الاصفیاء، مثنوی قصہ عبرت ومزمل وحشت، عجائب القصص، مغازی الصادقہ، عزانامہ سعود، تذکرہ غوثیہ، تواریخ تعلقدار ان اودھ، سفیر اودھ۔ ان کا الگ الگ ذکر نامناسب معلوم ہوتا ہے کیونکہ یہ بے جا موضوع میں طوالت کا باعث ہوگا۔

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

سوانح نگاری کے ارتقاء میں اوپر ہم نے عربی فارسی تصانیف کے علاوہ دکنی مثنویوں، سیر رجال وشمائل، توزکوں، شعرائے اردو کے فارسی اردو تذکروں اور تخلیقات کا ذکر کیا۔ ان سب میں کم وبیش سوانحی عناصر پائے جاتے ہیں جن سے ہمیں سوانح کے ارتقائی منازل کا پتہ چلتا ہے۔ درحقیت یہ پورا دور مشرقی طرز سوانح نگاری کا نمونہ ہے اور اس میں شاذ و نادر ہی کہیں مغربی اثر ملتا ہے۔ سید عبداللہ کے بقول:

''سوانحی اعتبار سے اس زمانے کا قابل ذکر سرمایہ تذکروں سے عبارت ہے اور تذکروں سے الگ صحیح معنی میں سوانح عمریاں لکھنے کا رواج جدید مغربی اثرات کا رہین منت ہے[1]''

اس اقتباس سے یہ نتیجہ نکالنے میں دیر نہیں لگتی کہ اردو سوانح نگاری کا باقاعدہ آغاز مغربی خیالات کے اثر سے ہوا جس کا سہرا حالی اور شبلی کے سر جاتا ہے۔ یہ اثر اردو کی ابتدائی سوانح نگاری کو کیا رنگ دیتا ہے اس سلسلے میں سید عبداللہ ایک تاریخی جائزہ پیش کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''مغربی اثرات کے نفوذ کے بعد اردو میں سوانح نگاری کی ابتدائی کوششوں میں کسی حد تک مناظرانہ رنگ پایا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہندوستان میں سترھویں اور اٹھارویں صدی میں عیسائیوں کی تبلیغی کوششوں کا ایک خاص پہلو یہ تھا کہ وہ حضرت رسول کریمؐ اور اسلام کے مقدس نام آوروں کی سوانح عمریاں لکھ کر اسلام کی حقانیت کے متعلق غلط فہمیاں پیدا کرتے تھے۔ یہ سلسلہ عیسائیوں تک محدود نہ تھا۔ اس میں کبھی کبھی ہندو مورخ بھی شریک ہو جاتے تھے۔ اس زمانے کی عیسائی اور ہندو تاریخ نگاری کی اصل روح بھی یہی ہے۔ اس کا ردعمل یہ ہوا کہ مسلمانوں میں تاریخ نگاری اور سوانح نگاری کی ایک جوابی تحریک پیدا ہوئی۔ چنانچہ سید احمد خاں کی کتاب ''خطبات احمدیہ'' بھی اس سلسلے کی

---

[1] سید عبداللہ۔ سرسید اور ان کے نامور رفقاء، علی گڑھ، ۱۹۸۸ء، ص ۹۵

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

ایک کڑی ہے۔ سرسید کے زمانے کے اکثر مورخ اور سوانح نگار
ان اثرات سے متاثر ہوئے۔ مولوی چراغ علی کے دو رسالے
''بی بی ہاجرہ'' اور ''ماریہ قبطیہ'' اور مولی نذیر احمد کی کتاب
''امہات الامہ'' انہیں مناظروں کی فضا کی مخلوق ہے تاہم سرسید
کے دور کے سب سے بڑے سوانح نگار شبلی اور حالی کی تصانیف
میں فنی محاسن بھی موجود ہیں[1]''

حالی جدید اُردو سوانح نگاری کے موجد قرار دئے جاسکتے ہیں کیونکہ سب سے پہلے انہوں نے جدید اُردو سوانح نگاری کو تذکرہ کی روش سے آزاد کیا۔ ان کی پہلی سوانح عمری کی کتاب حیات سعدی ۱۸۸۶ء کا دیباچہ گویا اردو سوانح نگاری کا منشور ہے۔ اس میں انہوں نے یہودیوں، یونانیوں اور رومیوں کے یہاں سوانح نگاری کی ابتداء و ارتقاء پر اظہار خیال کیا ہے۔ از منہ وسطی میں عیسائیوں کے اولیاء، شہدا اور مجتہدین کے تذکروں کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ اس میں یہ ذکر بھی ہے کہ سترھویں صدی سے انگلستان میں سوانح نگاری کی ابتداء اور ترقی ہوئی اور انیسویں صدی میں کئی جلدوں میں میں مشاہیر کی حیات اور کارناموں پر روشنی ڈالی گئی۔ حتی کہ تاریخ کی طرح سوانح نگاری نے بھی فلسفے کی شکل اختیار کرلی تھی۔ انھوں نے مشرقی سوانح نگاری میں سوائے رجال حدیث کے اوروں کے حال میں درایت کے بجائے محض روایت پر عمل ہونے نیز فارسی میں سوائے تاریخی شخصیتوں کے مثلاً سلاطین، وزرا، امرا وغیرہ کے کسی اہل کمال کی کوئی مستقل سوانح عمری نہ ہونے کا اعتراف کیا ہے۔ حالی نے اس دیباچے میں سوانح نگاری کے اخلاقی فائدوں اور اس کے علم الاخلاق سے مقابلے وغیرہ کے بعد اس کی یادگاری خصوصیات پر زور دیا ہے۔ حالی کو زبان پر اس قدر گرفت تھی کہ انہوں نے محض پانچ صفحات میں یہ سب کچھ بیان کردیا ہے۔ نیز انہوں نے ''حیات سعدی'' کے ماخوذات کا بھی ذکر کردیا ہے۔ مندرجہ ذیل اقتباس سے بیوگریفی کے بارے میں ان کے نقطۂ نظر کی پوری وضاحت ہوسکتی ہے:

---

[1] سید عبداللہ۔ میر انیس سے عبدالحق تک، دہلی، ۱۹۶۵ء، ص ۳۸۔۱۳۷

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

''بیوگرفی ان بزرگوں کی ایک لازوال یادگار ہے جنہوں نے اپنی نمایاں کوششوں سے دنیا میں کمالات اور نیکیاں پھیلائی ہیں اور جو انسان کی آئندہ نسلوں کے لئے اپنی مساعی جمیلہ کے عمدہ کارنامے چھوڑ گئے ہیں خصوصاً جو قومیں کہ علمی ترقیات کے بعد پستی اور تنزل کے درجے کو پہونچ جاتی ہیں، ان کے لئے بیوگرفی ایک تازیانہ ہے جو ان کو خواب غفلت سے بیدار کرتا ہے۔ جب وہ اپنے اکابر و اسلاف کی زندگی کے حالات اور ان کے کمالات دریافت کرتے ہیں تو ان کی غیرت کی رگ حرکت میں آتی ہے اور اپنی کھوئی ہوئی عزت اور برتری کے دوبارہ حاصل کرنے کا خیال ان کے دلوں میں پیدا ہوتا ہے۔ انگلستان کے ایک مشہور مصنف کا قول ہے: ''بیوگرفی چلا چلا کر اور سمندر کے طوفان کے طرح غل مچا کر یہ آواز دیتی ہے کہ جاؤ اور تم بھی ایسے ہی کام کرو۔''[1]

حیات سعدی کو مصنف نے دو ابواب میں تقسیم کیا ہے اور آخر میں خاتمہ ہے۔ پہلے باب میں شیخ سعدی کی سوانح عمری کا بیان ہے اور دوسرے باب میں ان کی تصنیفات کا مفصل ذکر ہے۔ خاتمے میں ان کے عام حالات اور شاعری پر بالا جمال نظر ڈالی گئی ہے۔ حالی نے سعدی کی شہرت و مقبولیت کے پیش نظر ان کی حیات قلم بند کرنے کا ارادہ تو کر لیا تھا لیکن انہیں اس کے لیے مواد کی کمیابی پر سخت مایوسی ہوئی۔ یہ انہیں کی ہمت اور حوصلہ مندی تھی کہ مختلف جگہوں سے خوشہ چینی کر کے اور اپنی صلاحیت کی بنیاد پر ایک ایسی سوانح عمری مرتب کی کہ شبلی جیسے سخت نقاد کو بھی اس کے دلچسپ محققانہ اور اور بے مثل سوانح عمری ہونے کا اعتراف کرنا پڑا۔ یہ کہا جاتا ہے کہ سعدی کی کلیات میں ہزلیات و مضحکات بھی ہیں جو ان کے کلام کے بدنما داغ ہیں لیکن حالی نے سعدی کو اس کا ذمے دار نہیں ٹھہرایا ہے۔ دراصل سعدی نے اس سلسلے میں مجموعہ

---

[1] الطاف حسین حالی۔ دیباچہ حیات سعدی، دہلی ۱۹۹۲ء، ص ۱۳۔۱۲

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

غزلیات کے شروع میں چند سطریں معذرت آمیز عربی عبارت میں لکھی ہیں کہ ان کو اس کے لئے ایک بادشاہ زادے نے مجبور کر دیا تھا چنانچہ انہیں اس کی بات ماننی پڑی۔ عبارت کے آخر میں انہوں نے اس غلطی پر نادم ہو کر خدا سے مغفرت بھی مانگی ہے۔ غرض حالی نے سعدی کے اس عذر کو قرین قیاس مانا ہے اس لئے ان پر اعتراض کی کسی بھی کوشش کو بے جا قرار دیا ہے۔

بہر حال حیات سعدی کی اہمیت اس لحاظ سے مسلم ہے کہ حالی نے سب سے پہلے جدید سوانح نگاری کے اصولوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے، ہیرو کے مزاج، اخلاق و عادات، کردار پر سماجی احوال اور بیرونی مناظر کا اثر دکھایا ہے اور بتایا ہے کہ شیراز اور فارس کی عام فضا کیا تھی جس نے ہیرو کی شخصیت پر اپنا اثر ڈالا۔ طبعی اثرات کا نظریہ حالی نے اردو میں سب سے پہلے پیش کیا۔ اس سوانح عمری کے مطالعہ سے مجموعی طور پر سعدی کے بچپن، تعلیم و تربیت، جوانی، سیر و سیاحت، دانشمندی اور سلیم الطبعی جیسے اوصاف نیز ان کی شاعری کی خصوصیات واضح ہو جاتی ہیں۔

مولانا حالی کی ترتیب شدہ دوسری سوانح عمری یادگار غالب (۱۸۹۷ء) ہے۔ اس کی عظمت کے لیے صرف یہی دلیل کافی ہے کہ غالب کے مطالعے کے لیے اس کتاب کو نظر انداز کرنا گویا مطالعے میں بے توجہی کا اظہار کرنا ہے۔ حالی نے اپنی ذاتی واقفیت (کیونکہ ان کے ہم عصر اور استاذ تھے) اور غالب کے دوستوں و رشتہ داروں وغیرہ کی معلومات، ان کے حالات اور اخلاق و عادات کا سراغ لگانے کے علاوہ ان کی تصانیف کو اکٹھا کر کے ان سے بھی ان کے حالات اخذ کئے ہیں۔ حالی نے ان کی تصنیفات سے اقتباسات کے علاوہ ان کے کلام کے انتخاب اور اس کی تشریح سے ان کے کردار کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالی ہے۔ انہوں نے غالب کی شخصیت میں زندہ دلی اور شگفتگی جیسے اوصاف پر زور دیا ہے کیونکہ ان کے پیش نظر ابھی سوانح عمری کا مقصد صرف اصلاحی اور قوم میں جوش ولولہ پیدا کرنا تھا۔ اسی لئے انہوں نے اپنی پہلی دونوں سوانح عمریوں میں ہیرو کی خامیوں کو نظر انداز کیا ہے۔ حالی کے نزدیک ان کے زمانے کو دیکھتے ہوئے یہی معیار مناسب تھا۔ ''یادگار غالب'' کی

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

اہمیت کو شیخ چاند کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں:

''یادگار غالب میں حالی نے غالب کے سوانح حیات جس ترتیب وتبویت کے ساتھ قلم بند کئے ہیں اور واقعات کے انبار سے جو مطلب اور کام کی ضروری باتیں یکجا سلیقے سے جمع کردی ہیں وہ ان کی قوت استادی اور دماغی وعقلی سنجیدگی کی دلیل ہے۔ وہ واقعات کے ہجوم سے گھبراتے نہیں ہیں بلکہ نہایت استقلال اور خاطر جمعی سے ان گوناگوں اور مختلف ومتضاد نوعیتوں کے حالات وواقعات کو قابو میں لاکر قلم بند کرتے ہیں۔[1]''

حالیؔ کے قلم سے نکلی ہوئی تیسری اور آخری سوانح ''حیات جاوید'' ہے۔ یہ تیسرے باب میں ہمارا اصل موضوع بحث ہے لہٰذا یہاں اس کے ذکر سے بے جا طوالت ہوگی۔ حالی کی تصنیف کردہ ان تینوں سوانح عمریوں کے بارے میں سید احتشام حسین اپنی بیش قیمت رائے پیش کرتے ہیں:

''حالی کی لکھی ہوئی تین سوانح عمریاں اردو ادب کے خزانے میں بے بہا جواہر ہیں جنھیں پرکھنا آسان نہیں ہے۔ ان میں مواد کی ترتیب اور انشاء پردازی کا حسین امتزاج ہے۔ موضوع کا انتخاب مصنف کی شخصیت کا بھی پتہ دیتا ہے۔ حالی اگر اخلاق کی مخصوص قدروں کے علم بردار نہ تھے تو کچھ بھی نہ تھے اس لئے گلستاں بوستاں کے مصنف شیخ سعدی کی سوانح عمری لکھ کر انہوں نے اپنی اس خواہش کو تسکین دی جو اخلاق کے نظام کو استوار رکھنا چاہتی تھی۔ یادگار غالب کے نام سے اپنے استاد کے سوانح حیات قلم بند کئے اور شعر وشاعری کے اہم نکات کے پردے میں اس دور کے ایک معمولی انسان کی زندگی کے نقش ابھارے۔ حالی عمل کے میدان میں سرسید کے لفظ لفظ سے متفق تھے۔ اس لئے

---

[1] شیخ چاند۔ (مضمون) نثر حالی، ماخوذ از: یاد حالی مرتب: سید محی الدین، دہلی، ص ۳۰۔۳۹

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

حیات جاوید صرف سرسید کی زندگی کا خاکہ نہیں ہے بلکہ اس
جدوجہد کی تفسیر ہے جو نئی زندگی کے مطالبوں کی شکل میں پیدا
ہو رہی تھی اور قدامت پرست جن کی مخالفت کر رہے تھے۔[1]"

اس دور کے دوسرے عظیم اور اہم سوانح نگار شبلی ہیں۔ ان کی سوانح عمریوں کے موضوع عموماً تاریخی اور مذہبی ہیں۔ ان کی سوانحی تصانیف میں المامون، سیرت النعمان، الفاروق، الغزالی، سوانح مولانا روم، سیرت النبی کے نام لیے جاتے ہیں۔ ہم یہاں ان کا ذکر اسی حد تک کریں گے جو ہمارے لئے سوانح نگاری کا ارتقاء دکھانے میں معاون ثابت ہو۔ ظاہر ہے کہ ان کا علیحدہ علیحدہ ذکر تفصیل چاہتا ہے جس کے لئے ہمیں ایک علیحدہ باب کی ضرورت ہوگی۔

المامون (۱۸۸۹ء) دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصے میں مامون رشید کی ولادت، تعلیم و تربیت، خانہ جنگیاں، فتوحات ملکی اور وفات تک سارے حالات درج ہیں۔ دوسرے حصے سے ملکی حالات اور مامون کے تمام اخلاق و عادات کا اندازہ ہوتا ہے۔ المامون کی تصنیف سے مصنف کا مقصد سوانح نگاری نہیں تھا بلکہ دراصل وہ مامون رشید کی تاریخ پیش کرنا چاہتے تھے۔ اس میں ہم کو سوانح کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ ہم کو اس سے مامون کے عہد تاریخ، خانہ جنگیوں اور سیاسی واقعات کا سیرت کے مقابلے میں زیادہ اچھی طرح اندازہ ہوتا ہے۔ شبلی نے محنت سے تاریخی واقعات اور شواہد کی تلاش کی ہے۔ اس سے محسوس ہوتا ہے کہ وہ خلیفہ کا مرقعہ دیانتدارانہ طریقے پر پیش کرنا چاہتے تھے جس میں وہ بہت حد تک کامیاب بھی ہوئے ہیں۔

شبلی کی دوسری تصنیف سیرۃ النعمان (۱۸۹۱ء) میں سوانح نگاری کا پہلو نمایاں ہے۔ یہ بھی دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلا حصہ امام ابوحنیفہ کے حالات زندگی پر مشتمل ہے اور دوسرا حصہ ان کے کارناموں پر روشنی ڈالتا ہے۔ اس تصنیف میں شبلی نے انہیں باتوں اور واقعات پر زور دیا ہے جو عقل و ادراک کے معیار پر پوری اترتی ہیں۔ محض خوش اعتقادی سے پیدا شدہ واقعات پر زور نہیں دیا۔ عقیدت و محبت کے باجود مصنف

---

[1] سید احتشام حسین۔ تنقیدی جائزے، لکھنؤ ۱۹۵۶ء ص ۱۵۳

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

نے فن سوانح نگاری کے تقاضوں کے پیش نظر شخصیت کو مسخ نہیں ہونے دیا۔

الفاروق (۱۸۹۸ء) شبلی کی اہم سوانحی تصنیف ہے۔ یہ کتاب اپنے مواد کی تشکیل، سوانح نگارانہ تکنیک اور مصنف کی ذاتی دلچسپی کے لحاظ سے نمایاں فوقیت رکھتی ہے۔ اس کے مواد کے حصول کے لئے انہوں نے روم و شام کا بھی سفر کیا۔ اس کتاب کو مصنف نے دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے حصے میں بحیثیت سوانح نگار، ہیرو کے حالات اور سیاسی رجحانات کے ساتھ اس عہد کی تاریخ اور تہذیب و تمدن کو پس منظر کے طور پر پیش کیا ہے۔ حصہ دوم میں حضرت عمرؓ کے تمام ملکی، مالی اور فوجی انتظامات کی تفصیل ہے۔ اخلاق و عادات اور خصوصاً مذہبی اجتہادات کا تفصیل سے ذکر ملتا ہے۔ اس تصنیف میں شبلی کا فنی شعور درجہ کمال پر نظر آتا ہے۔ بلاشبہ یہ مولانا شبلی کی اور اردو ادب و سوانح نگاری کی بہترین تصانیف میں شمار کی جاسکتی ہے۔

الغزالی (۱۹۰۲ء) بھی دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلا حصہ حیات سے متعلق ہے جو نہایت مختصر ہے۔ حصہ دوم میں امام غزالی کی تصنیفات پر تبصرہ ہے۔ کتاب کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ شبلی کا مقصد سوانح نگاری نہ تھا بلکہ علما کو اپنے نقطۂ نظر کے مطابق ایک خاص سطح پر لانا تھا۔ پھر بھی شبلی نے موٹے موٹے واقعات کو اس طرح پیش کر دیا ہے کہ اس پر ان کی سوانح نگاری کی بنیاد رکھی جاسکتی ہے۔

''سوانح مولانا روم'' (۱۹۰۲ء) ''الغزالی'' کے بعد شائع ہوئی۔ اس کے پہلے حصے میں مولانا شبلی نے نام و نسب، تعلیم و تربیت، شادی، اولاد، وفات وغیرہ کا تذکرہ بڑے دلچسپ انداز میں کیا ہے۔ دوسرے حصے میں مولانا رومی کی تصنیفات پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ ان کی مثنوی کو شبلی نے علم الکلام کے ایک شاہکار کا درجہ دیا اور یہی شبلی کا اصل مقصود ہے۔

سیرت النبی (۱۹۱۰ء) شبلی کی آخری اور ایک شاہکار تصنیف ہے۔ یہ ایک ایسی زندہ جاوید تصنیف ہے کہ اس کی مثال کسی دوسری زبان میں نہیں ملتی۔ شبلی نے صرف اس کی دو جلدیں ہی لکھی تھیں کہ ان کا انتقال ہو گیا۔ باقی چار جلدیں ان کے شاگرد سید سلیمان ندوی نے ترتیب دیں۔ شبلی نے ابتدائی دونوں جلدوں میں حضور

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

اکرمؐ کی شخصیت کی بشری خصوصیات کا مرقع اس خوبی سے پیش کیا ہے کہ اس کتاب کو اردو ادب کی بہترین سوانح عمریوں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ انہوں نے بشری کمزوری کی پردہ پوشی کرنے کی کوشش نہیں کی ہے گویا انہوں نے آنحضرتؐ کے سوانح حیات کو جدید رنگ میں پیش کیا ہے۔

حالی کے عہد میں شبلی و حالی کے علاوہ جن لوگوں نے سوانح عمریاں لکھیں ان میں ذکاء اللہ، نذیر احمد، چراغ علی اور عبدالحلیم شرر کے نام اہم ہیں۔ سرسید احمد کی تخلیقات سیرت فریدیہ، آثار الصنادید اور خطبات احمدیہ میں بھی سوانحی مواد ملتا ہے۔ سیرت فریدیہ میں سرسید نے اپنے نانا فرید الدین کے حالات لکھے ہیں۔ آثار الصنادید کے چوتھے باب میں چند مشاہیر دہلی کے احوال کا بیان ملتا ہے۔ خطبات احمدیہ کے بارھویں خطبے میں حضورؐ کے بارہ سال کی عمر تک کے حالات قلم بند ہیں گویا سرسید نے ان تصنیفات کے ذریعے غیر شعوری طور پر سوانح نگاری کے ارتقاء میں مدد کی ہے۔ لیکن ان مصنفین کی سوانحی تصنیفات میں جدید اصولوں کو پیش نظر نہیں رکھا گیا۔ ذکاء اللہ کا سارا سوانحی کام ملکہ وکٹوریہ اور شہزادہ البرٹ کی لائف تک محدود ہے۔ نذیر احمد اور چراغ علی کی سوانح عمریاں زیادہ اہمیت نہیں رکھتی ہیں اس لئے کہ یہ محض مناظرانہ ہیں۔ البتہ عبدالحلیم شرر کی سوانح عمریاں، خاکے اور مرقعے اس نقطۂ نظر سے ضرور قابل توجہ ہیں کہ ان میں مصنف کی سوانحی نظر اور شخصی جزئیات پر زیادہ زور ہے اور نصب العین بھی سوانح ہے۔ اگر دوسرا مقصد ہے بھی تو وہ ثانوی اور ضمنی ہے۔ لیکن بہرحال وہ خالص سوانح نگار نہیں ہیں۔ انہوں نے اپنے ناولوں کو تاریخی رنگ دینے کی کوشش کی ہے۔ اپنے سوانحی خاکوں میں انہوں نے ناول کی دلکشی اور حسن کو سمو دیا ہے۔ ۱۹۰۶ء میں شرر نے چھوٹی چھوٹی سوانحی تصنیفات کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ ان میں جنید بغدادی، لارڈ بیکن، ابوبکر، شبلی، سکینہ بن حسین، خواجہ معین الدین چشتیؒ، سوانح عمری رستم تہمتن اور عائشہ صدیقہؓ قابل ذکر ہیں۔ ان کے موضوعات تاریخی اور علمی ہیں۔ اس طرح سوانح نگاری اس دور میں ایک خاص شکل اختیار کر لیتی ہے اور ادب میں اپنے مختلف ترقیاتی نقوش چھوڑتی ہے۔

★★

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

باب سوم

حالی کی سوانح نگاری کا تنقیدی جائزہ

حیات جاوید کی روشنی میں

فن سوانح نگاری کی بحث کے ذیل میں یہ بات آ چکی ہے کہ کسی سوانح کے موثر یا غیر موثر ہونے میں سوانح نگار کی شخصیت کا سب سے زیادہ اہم رول ہوتا ہے۔ چنانچہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حیات جاوید کی روشنی میں حالی کی سوانحی کارکردگی کی بحث سے قبل حالی کی شخصیت کا مختصراً جائزہ لیا جائے۔ آگے چل کر اس کی روشنی میں ہم یہ دیکھیں گے کہ کیا واقعی حالی نے سرسید جیسی عظیم شخصیت کی سوانح نگاری کا حق سوانح نگاری کے اصولوں کے تحت ادا کیا ہے یا نہیں۔ اس سلسلے میں حالی کی سیرت اور ان کی خدمات اور سرسید سے ان کے تعلقات ہمیں صحیح نتائج تک پہونچانے کا کام کریں گے۔

خواجہ الطاف حسین حالی پانی پت میں ۱۸۳۷ء میں پیدا ہوئے۔ یہیں ان کی پرورش ہوئی۔ ان کو پڑھنے کا بچپن سے بے حد شوق تھا اور حافظہ غیر معمولی طور پر اچھا تھا چنانچہ انہوں نے جلد ہی قرآن شریف حفظ کر لیا۔ حفظ قرآن کے بعد فارسی کی تھوڑی سی تعلیم سید جعفر علی سے حاصل کی جو فارسی کے بہت اچھے ادیب اور سخن فہم سمجھے جاتے تھے۔ فارسی کے ساتھ انہوں نے عربی صرف و نحو پڑھی۔ ان کی خواہش تھی کہ اپنی تعلیم کو تکمیل کے درجے تک پہونچائیں لیکن ۱۷ برس کی عمر میں حالی کی شادی کر دی گئی اور بظاہر ان کی تعلیم کا دروازہ بند ہو گیا۔

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

مگر علم کی پیاس ان کو دلّی لے آئی۔ وہاں کچھ صرف اور نحو اور ابتدائی کتابیں منطق کی پڑھیں۔ غالب کی صحبت بھی وہیں ان کو ملی۔ شاعری کا فطری جوہر ان کے اندر جب غالب نے دیکھا تو کہا،

> "اگرچہ میں کسی کو فکرِ شعر کی صلاح نہیں دیا کرتا لیکن تمہاری نسبت میرا خیال ہے کہ اگر تم شعر نہ کہو گے تو اپنی طبیعت پر سخت ظلم کرو گے[1]"

ظاہر ہے کہ سترہ اٹھارہ سال کی عمر کے لڑکے سے غالب جیسے جوہر شناس نے یہ بات کچھ دیکھ کر اور کچھ سمجھ کر ہی کہی ہوگی۔

بزرگوں اور عزیزوں کے جبر سے حالی کو اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ کر پانی پت واپس جانا پڑا۔ حصار میں سرکاری ملازمت کے سلسلے میں داخل ہو گئے مگر ۱۸۵۷ء کی بدامنی میں گھر چلے آئے۔ قریب چھ برس تک وہیں رہ کر بغیر کسی ترتیب اور نظام کے کبھی منطق یا فلسفہ کبھی حدیث کبھی تفسیر پڑھتے رہے۔

ایک بار پھر حالی تلاش معاش میں دلّی آئے۔ یہاں ان کی ملاقات نواب مصطفیٰ خان شیفتہ سے ہوئی۔ انہوں نے حالی کو تقریباً آٹھ سال تک اپنے ساتھ بڑی شفقت و محبت کے ساتھ رکھا۔ اس صحبت سے حالی کی شاعری چمک اٹھی۔ غالب سے حالی کو اتنا فائدہ نہیں پہونچا جتنا نواب صاحب کی صحبت سے۔ وہ مبالغے کو ناپسند کرتے اور سیدھی سچی باتوں کو محض حسن بیان سے دلفریب بنانا اسی کو منتہائے کمال شاعری سمجھتے تھے۔ اس کا اثر حالی پر بھی ہوا جس کا انہوں نے خود اعتراف کیا ہے۔

۱۸۶۹ء میں ہی غالب کے بعد شیفتہ کا بھی انتقال ہو گیا۔ اس مرتبہ لاہور میں پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو میں انہیں ایک جگہ مل گئی۔ یہاں ان کے ذمے یہ کام تھا کہ جو ترجمے انگریزی سے اردو میں ہوں ان کی عبارت درست کر دیا کریں۔ لاہور کے اس چار برس کے قیام نے حالی کے مذاق ادب اور مذاق شعر کو بہت کچھ بدلا اور اس بہانے قدرت نے انگریزی نہ پڑھ سکنے کی کمی پوری دی۔ انگریزی کتابوں کے

---

[1] صالحہ عابد حسین۔ یادگار حالی علی گڑھ ۱۹۵۵ء، ص ۱۲۹

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

ترجموں پر نظر ڈالنے سے وہ انگریزی زبان و ادب کی بہت سی کتابوں کے مطالب سے واقف ہو گئے۔ اب انہیں ادب کے صحیح مقام کا اندازہ ہوا۔ مغربی ادب سے انکی دلچسپی بڑھنے لگی اور روز بروز ان کی نظروں میں مشرقی لٹریچر خاص کر فارسی لٹریچر کی، جس سے اب تک انہیں بہت لگاؤ تھا، وقعت کم ہونے لگی۔ ان پر نہ صرف مغربی ادب کا گہرا اثر پڑا بلکہ انگریزی زبان سے بھی بہت متاثر ہوئے۔ چنانچہ وہ اپنی نثر میں انگریزی الفاظ بے تکلف استعمال کرتے ہیں۔ حیات جاوید میں انگریزی الفاظ کا جا بجا استعمال بھی اسی کا مظہر کا ہے۔

۱۸۷۶ء میں دلی آنے کے بعد حالی کے دل پر انتہائی مایوسی اور افسردگی چھائی ہوئی تھی۔ وہ ایک نئی الجھن اور ذہنی کشمکش میں مبتلا تھے۔ نوجوانی کا دور گزر چکا تھا۔ عشقیہ شاعری کا ولولہ سرد ہو گیا تھا۔ اب بجائے عشق کے روگ کے قوم کا درد ان کو ستا رہا تھا۔ ملک اور قوم کی زبوں حالی نے ان کے درد آشنا اور حساس دل پر بہت اثر ڈالا۔ انہیں اپنا ۲۰۔۲۲ سال کا سرمایۂ شعر بالکل بے قدر نظر آ رہا تھا۔ کسی برتر اور اعلیٰ کام کا ولولہ ان کے دل میں ابھر رہا تھا۔ شعر و ادب میں اصلاح، قوم کو ابھارنے کا جذبہ، انسانوں کو انسان بنانے کی تمنا غرض مختلف جذبات تھے جو ان کے دل میں موجزن تھے مگر ابھی تک انہیں صحیح راستے کا علم نہ ہو سکا تھا۔ انہیں حالات میں حالی کی ملاقات سرسید سے ہوئی۔ حالی ان کی زبردست شخصیت، ان کی مضبوط سیرت اور سب سے زیادہ ان کے بلند مقصد سے بے حد متاثر ہوئے اور دل و جان سے سرسید کی ساتھ ہو گئے۔ اس طرح حالی کی ڈوبتی نیا کو کنارا مل گیا۔

سرسید نے حالی کے دل پر جادو کا سا اثر کیا۔ سرسید ہی کے اشارے پر انہوں نے مشہور و معروف نظم "مسدس حالی" لکھی جو آج بھی ادب میں ایک مخصوص مقام رکھتی ہے۔ اس نظم کی سرسید نے بہت تعریف کی اور اسے آخرت میں اپنی نجات کا ذریعہ بتایا۔ اب حالی کی زندگی قوم کی خدمت کے لئے وقف ہو گئی۔ وہ تصنیف و تالیف کے کام میں کافی وقت صرف کرتے رہے۔

اب ایک نظر حالی کی سیرت و اخلاق پر بھی ڈالتے ہیں۔ سید عابد حسین اپنے

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

مضمون ''حالی'' میں لکھتے ہیں:

''ایک سن رسیدہ عالم شاعر، حق پرست، حق گو، صاف دل، پاک باطن، حکیم، مفکر، خوددار، غیرت مند، محبت کا پتلا، اخلاق کا مجسمہ، دوستوں کا دوست، عزیزوں کا کفیل، غیروں کا ہمدرد، پانی پت میں رہتا ہے۔ اس کا دل محبت سے معمور ہے۔ اس کی زندگی خدمت کے لئے وقف ہے..... یہ شخص سب کی فرمائش پوری کرتا ہے۔ سب کو جواب دیتا ہے اور اس عجز و انکسار کے ساتھ جیسے ان کے احسان کا شکریہ ادا کر رہا ہو۔ کوئی تعریف کرے تو شرمندہ ہوتا ہے۔ بجا اعتراض ہو تسلیم کر لیتا ہے، بے جا اعتراض ہو چپ ہو رہتا ہے۔ دشمن پھبتیاں کستے ہیں، گالیاں دیتے ہیں یہ چشم پوشی سے کام لیتا ہے۔ دوستوں میں سے کوئی جواب دینا چاہے تو اسے منع کر دیتا ہے۔ بغض و حسد کے بادل برستے رہتے ہیں اور برس کر چلے جاتے ہیں۔ حلم کا دریا بہتا چلا جاتا ہے[1]''

ان بے شمار صفات کا ایک انسان میں یکجا ہونا کوئی معمولی بات نہیں۔ ان کے استغنا اور قناعت کی ایک مثال ایسی ہے جس کی مثال اردو ادب کی تاریخ میں شاید ہی ملے۔ انہوں نے اپنی تصانیف سے کبھی مالی فائدہ نہیں اٹھایا۔ ان کا اصول تھا کہ جو کتاب قوم کی اصلاح کی غرض سے لکھی جائے اسے کسی شخص کی ملکیت نہیں ہونی چاہیئے۔ اسی لئے انہوں نے ایک دو کتاب کے سوا باقی مشہور تصانیف کی رجسٹری نہیں کرائی اور نہ حق تصنیف لیا۔ حالی کو شہرت اور نام و نمود کی بھی طلب نہیں تھی۔ وہ اس حقیقت کو جانتے تھے کہ جسے شہرت و نمود کی چاٹ لگ جائے وہ قوم کی ٹھوس اور سچی خدمت نہیں کر سکتا۔ مولانا محمد علی کے بقول:

''اگر حیات جاوید اور مسدس حالی کا مصنف شہرت پسند ہوتا اور

---

[1] سید عابد حسین۔ مضامین عابد، دہلی ۱۹۴۷ء، ص ۸۲۔۸۱

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

کسب شہرت کرتا تو بلاخوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ اس کا نام دنیاوی اور مادی نقطہ نظر سے بہت بلند ہوتا لیکن اس نے کبھی بازار میں بکنا گوارا نہیں کیا اور مولانا حالی کا یہ امتیازی کیریکٹر ہماری قوم میں بہت ہی کم نظر آتا ہے[1]''

حالی کی خاکساری و بے نیازی کا یہ عالم تھا کہ بقول مولوی عبدالحق:

''انہوں نے اپنی کتابوں پر جو اصلی اور حقیقی معنوں میں تصنیف ہوتی تھیں ہمیشہ 'مرتبہ' لکھا، کبھی مؤلفہ یا 'مصنفہ' کا لفظ نہ لکھا[2]''

حالی میں اپنے ہم عصروں سے بھی رشک و رقابت کا جذبہ نہ تھا۔ ان کے بعض ہم عصر ان کی غیر معمولی علمی اور ادبی قابلیت اور عزت پر بڑا رشک کرتے تھے اور بعض تو اس رشک کو چھپا بھی نہیں سکے۔ لیکن مولانا حالی کے دل میں اپنے ہم عصروں اور ادیبوں کی بڑی عزت تھی اور وہ کھلے دل سے ان کی تعریف اور حوصلہ افزائیاں کیا کرتے تھے۔ انہوں نے اپنے ہم عصروں کی کتابوں پر جو ریویو لکھے ہیں ان میں علمی دیانت اور صدق دل کے ساتھ ان کی خوبیوں کو سراہا ہے۔

سرسید کی طرح حالی بھی رسوم و توہمات کو اسلام اور مسلمانوں کے لئے زہر سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اسلام کو اس روایتی قید اور بے جا بندشوں سے نہ آزاد کیا گیا تو تعلیم یافتہ طبقہ مذہب سے بیزار اور روگرداں ہو جائے گا۔ اس موضوع پر حالی نے ''حیات جاوید'' اور دیگر دو تین مضامین میں تفصیل سے لکھا ہے۔ وہ سرسید کو برخلاف اس وقت کے عالموں اور مذہب پرستوں کے سچا مسلمان، اسلام کا شیدائی اور مسلمانوں کا رہنما سمجھتے تھے اور باوجود بعض باتوں میں ان سے اختلاف رکھنے کے ان کے ان مذہبی اصلاحوں کے بڑے قدردان تھے جو سرسید کر رہے تھے۔ سرسید اور حالی کی کوششوں کا مقصد بجز اس کے کچھ نہ تھا کہ مسلمان ذلت سے نکلیں اور ان میں اپنی پستی کا احساس

---

[1] صالحہ عابد حسین۔ یادگار حالی، علی گڑھ ۱۹۵۵ء، ص ۴۲

[2] مولوی عبدالحق، چند ہم عصر، کراچی ۱۹۵۳ء، ص ۱۴۶

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

ہو۔ افادیت اور مقصدیت پر اس قدر زور دینے سے حالی کے بعض خیالات کو ہنگامی خیال کیا گیا حالانکہ حالی کا مقصد قومی خیر خواہی تھا اور اس سلسلے میں انہیں جہاں سے بھی مفید خیالات ملے انہوں نے قبول کئے۔

۱۸۵۷ء کے انقلاب نے حالی کی ذہنی زندگی پر غیر معمولی اثر ڈالا تھا اور اصلاح معاشرت وادب کی فکر اُن کو ستانے لگی تھی لیکن اُن میں کوئی واضح تصور اس وقت تک نہیں ابھر سکا جب تک ان کی سرسید سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ ان کی تحریک سے ذہنی ہم آہنگی کے بعد حالی کے ذہن کا رخ بدل گیا اور انہوں نے اپنی کاوشوں کو قومی وملی فلاح کے لئے وقف کر دیا۔ اس سلسلے کی پہلی مستقل تصنیف ''حیات سعدی'' کے نام سے منظر عام پر آئی۔ یہ اردو کی پہلی باقاعدہ سوانح عمری ہے جسے طرز جدید کی سائنٹفک بایوگرافی کا اچھا نمونہ کہا جا سکتا ہے۔ معتبر شہادتوں کے مطابق۔ یہ ۱۸۸۶ء میں شائع ہوئی۔ تحقیقی اور تنقیدی اعتبار سے اردو میں یہ کتاب سعدی کی شخصیت اور کلام کا بہتر سے بہتر جائزہ ہے۔ فارسی شعراء میں حالی سب سے زیادہ سعدی سے متاثر تھے اور اگر بغور دیکھا جائے تو حالی اور سعدی میں بہت حد تک ذہنی مماثلت ہے۔ فارسی شاعری کے برخلاف سعدی کے انداز بیان میں نمایاں طور پر حقیقت پسندی اور سادگی ہے۔ حالی اور سعدی دونوں اپنے دور کے مصلح تھے اور دونوں نے اپنی پوری زندگی اخلاقیات کا درس دینے میں گزار دی۔ یہی وجہ ہے کہ حالی کو ''سعدی ہند'' کہا جاتا ہے۔

حالی کی دوسری سوانح یادگار غالب (۱۸۹۷ء) ہے۔ غالب کے مطالعے کے سلسلے میں اس کتاب کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ گرچہ حالی کے مخصوص نقطۂ نظر نے بحیثیت سوانح عمری اس کتاب کی افادی حیثیت کو قدرے محدود کر دیا ہے لیکن یہ کتاب مرزا غالب کے کمالات انشاء پردازی وشاعری کا اچھا تجزیہ ہے۔ خود حالی کے بقول:

> ''مرزا کی لائف جیسا کہ ہم آئندہ کسی موقعے پر بیان کریں گے، فائدوں سے خالی نہیں ہے جو ایک بیوگرافی سے حاصل ہونے چاہئیں لیکن ان فائدوں سے قطع نظر کی جاتی تو بھی ایک ایسی زندگی کا بیان جس میں ایک خاص قسم کی زندہ دلی اور

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

شگفتگی کے سوا کچھ نہ ہو ہماری پژمردہ دل سوسائٹی کے لئے کچھ کم ضروری نہیں [1]۔''

یہاں حالی کی پہلی دونوں سوانح کی کتابوں کے ذکر کا مقصد یہ تھا کہ مجموعی حیثیت سے حالی کی سوانح نگاری کی مقصدیت کو سمجھ لیا جائے۔ سیاسی زوال اور معاشی انحطاط کی وجہ سے پوری مسلمان قوم میں اضمحلال کی صورت پیدا ہو گئی تھی اور ان کی ہمتیں ایسی پست اور عزائم اس قدر پژمردہ ہو چکے تھے کہ وہ ہر عملی پروگرام سے گھبراتے اور جدوجہد سے گریز کرتے تھے۔ ایسی حالت میں حالی قوم کے لئے عظیم شخصیات کے نمونے پیش کرنا چاہتے تھے۔ افادیت کا یہ پہلو حالی کے ہمیشہ پیش نظر رہا۔

حالی کی زندگی، شخصیت کا مجموعی تاثر، سیرت و اخلاق، دو دیگر سوانحوں اور ان کی مقصدیت کو پیش کرنے کے بعد انہیں چیزوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اب ہم حیات جاوید کا تفصیلی تعارف اور فن سوانح نگاری کی روشنی میں اس پر تنقیدی تجزیہ پیش کرتے ہیں۔ جس طرح عظیم شخصیات، جن کے اندر زیادہ اتار چڑھاؤ ہوتے ہیں، کی سوانحوں کی ترتیب میں سوانح نگار کو بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے پھر بھی وہ تنقید و تعریض کا شکار ہوتا ہے اسی طرح یہ فیصلہ کرنا کہ سوانح نگار نے اپنے موضوع کے ساتھ انصاف کیا یا نہیں خصوصاً اس وقت جب کہ موضوع مختلف فیہ ہو، آسان نہیں ہوتا۔ حیات جاوید کے موضوع بنے سرسید احمد خاں کی شخصیت بھی اپنے دور کی ایک ممتاز شخصیت تھی جس نے مسلم قوم کی ترقی کے لئے مسلسل قربانیاں پیش کیں۔ سرسید نے مسلمانوں کو جوش، جذبہ، ہمت، اور عقل کے حقیقی معنی سمجھائے ورنہ مسلمانوں کی تمام تر توجہ انگریزوں سے نفرت کرنے اور دل ہی دل میں برا بھلا کہنے پر صرف ہو رہی تھی۔ یہ شوروغوغا اپنے اندر نہ کوئی سکت رکھتا تھا اور نہ اس کی مدد سے زندگی میں کسی قسم کی کایا پلٹ کی جاسکتی تھی۔ بلکہ یہ احساس کمتری اور ذہنی انتشار کا سبب بنا ہوا تھا۔ سرسید نے سیاست کا انتہائی پہلو اختیار کر کے مسلمانوں کو زندہ رہنے کا سبق سکھا دیا اور انگریزی علوم ہی کی مدد سے انگریزی سیاست کی کاٹ کی۔ لوگ حالات کو سطحی طور پر

---

[1] حالی۔ دیباچہ یادگار غالب، مرتب: مالک رام، دہلی ۱۹۸۶ء، ص ۲۰

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

دیکھ رہے تھے، کسی کو حالات کی گہرائی کا اندازہ نہیں تھا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد ایک عرصے تک مذہبی شعور کے علاوہ کوئی شعور بیدار نہیں تھا۔ سرسید نے حالات کے لحاظ سے ایک خاص شعور کو قوم کے اندر جاگزیں کرنے کی کوشش کی اور اس تحریک کو ایک ایسی ذہنی تحریک بنا دیا جس کے اثرات آج تک جاری و ساری ہیں۔

سرسید ایک مختلف الجہات شخص تھے۔ انہوں نے اپنی ہنگامہ خیز زندگی میں سیاسی، تعلیمی، مذہبی، ادبی، تحقیقی۔ غرض ہر قسم کے علمی اور قومی مشاغل میں نمایاں حصہ لیا تب انہوں نے عمل کے ہر میدان میں اپنا نقش بٹھایا اور ہر جگہ دیرپا اثرات چھوڑے۔ ملکی سیاست میں بھی ان کے کارنامے مسلم ہیں۔ چنانچہ ان کے مخصوص سیاسی خیالات نے ہندوستان کے مسلمانوں کی روش کو بدلنے میں بڑا رول ادا کیا۔ مخصوص تعلیمی معاملات میں ان کے مخصوص نظریات نے علی گڑھ کی تعلیمی تحریک کی صورت اختیار کی اور مذہبیات میں انہوں نے فکر و تصور کے نئے زاوے پیدا کیئے۔ غرض علم و عمل کے تقریباً ہر شعبے میں انکی انقلاب آفرین شخصیت نے اپنے نقوش ثبت کئے۔ ظاہر ہے کہ ایسے شخص کی زندگی سطحیت کے ساتھ نہیں لکھی جا سکتی۔ حالی حیات جاوید کے دیباچہ میں اسی سلسلے میں لکھتے ہیں:

> ''لیکن ہم کو اس کتاب میں اس شخص کا حال لکھنا ہے جس نے چالیس برس برابر تعصب اور جہالت کا مقابلہ کیا، تقلید کی جڑ کاٹی ہے، بڑے بڑے علماء و مفسرین کو للکارا ہے، اماموں اور مجتہدوں سے اختلاف کیا ہے، قوم کے پکے پھوڑوں کو چھیڑا ہے اور ان کو کڑوی دوائیں پلائی ہیں، جس کو مذہب کے لحاظ سے ایک گروہ نے صدیق کہا ہے تو دوسرے گروہ نے زندیق کا خطاب دیا اور جس کو پالٹکس کے لحاظ سے کسی نے ٹائم سرور سمجھا ہے تو کسی نے نہایت راستباز لبرل جانا ہے۔ ایسے شخص کی لائف چپ چاپ کیونکر لکھی جا سکتی ہے[1]''

---

[1] حالی۔ دیباچہ حیات جاوید، دہلی ۱۹۹۰ء، ص ۲۶

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

چنانچہ ایسے شخص کی سوانح لکھنے کی ذمہ داری اتنی آسان اور اس کی زندگی کے اختلافی پہلوؤں میں منصفانہ محاکمہ اتنا سہل نہ تھا۔ مشکل یہ تھی کہ شخصیت کے مختلف طویل گوشوں کو سمیٹا کیسے جائے۔ پھر حالی کے سامنے اردو سوانح نگاری کے باقاعدہ اصول وضوابط بھی نہیں تھے۔ لہٰذا مصنف کے لئے یہ ذمے داری ایک مشکل ترین امتحان اور آزمائش تھی۔ موضوع اپنے مصنف کی نظر میں جس قدر اہم اور محبوب تھا اتنا ہی اس کو گرفت میں لانا مشکل تھا۔ اس کے باوجود حالی نے یہ بارِ گراں سر پر اٹھایا اور اس کی ذمہ داریوں سے کامیابی کے ساتھ عہدہ برآ ہو کر (بعض لغزشوں اور کوتاہیوں کے باوجود جن سے کوئی بھی انسان بری نہیں ہوسکتا) ایک ایسی یادگار تصنیف چھوڑی ہے جو سوانح نگاری کے فن میں پہلی منظم اور باقاعدہ کتاب کہی جاسکتی ہے۔ خلیق احمد نظامی اپنے ایک مضمون میں فرماتے ہیں:

> ''اردو میں اپنی نوعیت کی یہ پہلی سوانح حیات تھی جس کو مغربی طرز پر ترتیب دیا گیا تھا اور تحقیق وتنقید کے اعلیٰ ترین معیار کو سامنے رکھ کر واقعات کی تحقیق کی گئی تھی۔ حیات سعدی میں حالی کے اخلاقی اصول، یادگار غالب میں ان کی ادبی دلچسپیاں اور حیات جاوید میں احیاء ملت کے جذبات صاف دعوت فکر دیتے نظر آتے ہیں۔ حالی کے سب ہیرو اقدار عالیہ کے ترجمان ہیں[1]''

تاریخ عالم میں دو طرح کے آدمی زیادہ نمایاں ہوتے ہیں۔ ایک تو وہ ہیں جو کم تر درجے سے ترقی کر کے اعلیٰ درجے پر پہونچتے ہیں۔ دوسرے وہ ہیں جو اعلیٰ درجے سے گر کر تنزلی کی درجے پر پہونچ جاتے ہیں۔ دونوں قسم کے آدمیوں کی حیات میں حرکت اور جنبش پائی جاتی ہے اس وجہ سے ان کی حالت پر ہر شخص متوجہ ہوتا ہے اور ان کی زندگی سے ہر شخص تاثر لیتا ہے چاہے وہ کسی قسم کا ہو۔ دوسری نوعیت کے آدمیوں کی زندگیوں کا اگر مطالعہ کیا جائے تو محض عبرت کے علاوہ کوئی دوسرا تاثر نہیں اخذ کیا جاسکتا مگر پہلی قسم کے آدمیوں کے واقعات وحالات کا جائزہ لینے سے وہ ذرائع معلوم

---

[1] خلیق احمد نظامی۔ اے آنکہ زنور..... فکر ونظر سہ ماہی حالی نمبر، اکتوبر ۱۹۹۱ء، ص ۱۲۴

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

ہوتے ہیں جو انہیں بام عروج پر پہونچاتے ہیں۔ نیز وہ ہدایتیں اور نمونے بھی حاصل ہوتے ہیں جن کو اپنا کر ایک ادنی آدمی اعلی درجے تک پہونچ سکتا ہے یا کم از کم اس کی زندگی میں مثبت تبدیلیاں رونما ہوسکتی ہیں۔ لہٰذا پہلے قسم کی شخصیات کی زندگیاں دوسرے قسم کے آدمیوں کے مقابلے میں زیادہ مفید ہوتی ہیں اور قومی ترقی و تربیت کے لئے اس قسم کی زندگیاں پیش نظر رکھنے کے قابل ہوتی ہیں۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ ہماری قوم کا لٹریچر اس طرح کی سوانح عمریوں سے خالی تھا۔ حالی کے زمانے تک محض بعض سلاطین، بعض وزراء اور بعض علماء و مصنفین جیسے اشخاص کی لائفیں تیار ہوئی تھیں مگر حالات بدل چکے تھے اس لئے حالی نے بادشاہ و امراء وغیرہ کو چھوڑ کر سرسید کو اس لئے چنا کہ ان کی زندگی قوم کے لئے راہ عمل ثابت ہوسکتی تھی۔ دیباچہ حیات جاوید میں حالی بہت واضح انداز میں لکھتے ہیں:

> ''اگر چہ ہماری قوم میں بڑے بڑے اولوالعزم بادشاہ، بڑے بڑے دانشمند وزیر اور بڑے بڑے بہادر سپہ سالار گزرے ہیں مگر ان کے حالات اس کٹھن منزل میں جو ہم کو اور ہماری نسلوں کو درپیش ہے براہ راست کچھ رہبری نہیں کر سکتے۔ ہم کو اب دنیا میں محکوم بن کر رہنا ہے اور اس لئے وہ لیاقتیں جو سلطنت اور کشور کشائی کے لئے درکار ہیں ہمارے لئے بے سود ہوگی۔ ہمارے اسلاف میں حکماء و مصنفین کی بھی کچھ کمی نہیں ہے مگر وہ آج ہمارے لئے قابل تقلید نمونے نہیں بن سکتے[1]''

حالی کا ہرگز یہ مقصد نہیں تھا کہ سلف صالح کے حالات ہمارے لئے بالکل مفید نہیں ہیں بلکہ آگے چل کر وہ خود چند فوائد کا ذکر کرتے ہیں اور زمانے و حالات کے فرق پر اظہار خیال کرتے ہوئے اپنے وقت کے لوگوں کے لئے ان کو غیر کارآمد ثابت کرتے ہیں۔ انہیں کے الفاظ میں:

> ''ہم یہ نہیں کہتے کہ سلف صالح کے حالات ہماری قوم کے لئے

---

[1] حالی۔ دیباچہ حیات جاوید، دہلی ۱۹۹۰ء، ص ۱۹

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

بالکل فائدہ مند نہیں ہیں۔ ان کی بائیوگرافی میں وہ تمام اصول موجود ہیں جو قومی زندگی کے لئے بمنزلہ ارکان وعناصر کے ہیں۔ محنت، صبر، استقلال، غیرت، دلیری، اولوالعزمی اور عالی حوصلگی سب کچھ ان کے کارناموں میں موجود ہے مگر جن مہمات میں انہوں نے ان ہتھیاروں سے کام لیا تھا ہماری مہمات ان سے بالکل الگ جداگانہ ہیں جو شاید ان کو کبھی پیش نہیں آئیں۔ جن آلات سے انہوں نے ملک فتح کئے تھے ہم کو انہیں آلات سے دل فتح کرنے ہیں۔ جو عزت اور آبرو انہوں نے اپنی قوم کی سلطنت میں حاصل کی تھی وہ ہم کو غیر قوموں کی حکومت میں حاصل کرنی ہے ..... جب کہ ہماری حالت سلف کی حالت سے اس قدر بدلی ہوئی ہے تو ان کی بائیوگرافی ہماری مشکلات پر کیا روشنی ڈال سکتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ ان کی ہمت سے ہماری ہمت اور ان کی دلیری سے ہماری دلیری بڑھتی مگر یہ سمجھنا ہر شخص کا کام نہیں ہے کہ انہوں نے اپنی ہمت اور دلیری سے کیا کیا کام لیا تھا اور ہم کو اس سے کیا کام لینا چاہیئے ..... پس اگرچہ زمانۂ سلف کے مشاہیر بلکہ مجانبیل کی بائیوگرافی بھی منفعت سے خالی نہیں لیکن اس میں ہمارے لئے کوئی ایسی صاف اور کھلی شاہراہ موجود نہیں ہے جس پر ہم آنکھیں بند کر کے اپنی دشوار منزل طے کرتے چلے جائیں[1]"

تقریباً ۹۰ صفحات پر مشتمل یہ کتاب یعنی حالی کی تصنیف کردہ حیات جاوید سرسید کی زندگی پر ایک مفصل اور مبسوط سوانح عمری ہے۔ حالی کی سات سال کی مسلسل محنت، کاوش اور تگ ودو کے بعد ۱۹۰۱ء میں سرسید کے انتقال کے بعد یہ کتاب شائع ہوسکی۔ حالی اسے کئی سال سے مرتب کر رہے تھے لیکن انہوں نے سرسید کو کبھی نہیں

[1] حالی۔ دیباچہ حیات جاوید، دہلی ۱۹۹۰ء، ص ۲۱-۲۰

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

دکھائی اور نہ ہی سرسید نے اس کے دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ جب سرسید کا انتقال ہوا تو حالی کو اس بات کا بڑا افسوس ہوا کہ انہوں نے اس کا مسودہ سرسید کو کیوں نہیں دکھایا تا کہ وہ اپنے مفید مشوروں سے نوازتے۔ سرسید کے انتقال کے بعد حالی پوری تندہی اور یکسوئی کے ساتھ اس کام میں جٹ گئے تا کہ وہ جلد از جلد محسن قوم کی سیرت منظر عام پر لاسکیں اور لوگ اس سے سبق حاصل کرسکیں لیکن وہ یہ بھی نہیں چاہتے تھے کہ جلدی میں کام خراب ہو جائے۔ اسی زمانے میں خواجہ سجاد حسین کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں''

''لوگ ہر طرف سے اصرار کر رہے ہیں کہ دو تین مہینے کے اندر اندر کتاب مکمل کر دو مگر میں ہرگز کسی کی نہیں سنوں گا اور جب تک میرے حسب دلخواہ سرسید کی لائف مکمل نہ ہوگی اس وقت تک اس کا شائع ہونا نہ چاہوں گا۔ عربی میں ایک مثل ہے کہ کوئی نہیں دیکھتا کہ کام کتنی دیر میں ہوا بلکہ سب یہ دیکھتے ہیں کہ کام کیسا ہوا۔ لوگ اس بات کا لالچ دیتے ہیں کہ جس قدر جلد لائف تیار ہوگی اسی قدر کثرت سے فروخت ہوگی مگر اس بات کی مجھے مطلق پروا نہیں۔ لائف عمدہ لکھی جائے اگرچہ اس کی ایک جلد بھی فروخت نہ ہو[1]''

اس اقتباس سے سچے فن کار کا نقطۂ نظر جھلکتا ہے۔ اسی وجہ سے حالی نے اپنے فن کے ساتھ بھرپور انصاف کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ پورے طور پر اس میں کامیاب نہیں ہوسکے۔ کیوں اور کیسے ہوا اس کا تجزیہ ہم اگلے صفحات پر کریں گے۔

مولانا کو سرسید کی لائف لکھنے کا خیال سب سے پہلے اس وقت پیدا ہوا جب کہ وہ کالج کی بنیاد رکھ چکے تھے۔ مدرسۃ العلوم علی گڑھ میں قائم ہو چکا تھا اور تمام مخالفتوں کے باوجود اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھا۔ تہذیب الاخلاق میں سرسید اپنی دلکش تحریروں سے اردو زبان کو سیراب کر رہے تھے۔ اگرچہ سرسید رفاہ عام کے

[1] صالحہ عابد حسین۔ یادگار حالی، علی گڑھ ۱۹۵۵ء، ص ۲۴۰

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

کاموں میں ایک مدت سے مصروف تھے لیکن ہر کوئی اس سے واقف نہیں تھا۔ تاہم ملک میں ان کی خدمات کی قدر ہو چکی تھی۔ ان کی وقعت حالی کے دل میں بھی روز بروز زیادہ ہونے لگی تھی۔ اسی وقت سے حالی نے سرسید کی زندگی سے متعلق چیزوں کو قلم بند کرنا شروع کر دیا تھا۔ حالی نے کچھ سوال مرتب کر کے برائے جواب سرسید کے پاس روانہ کئے لیکن انہیں کسی سوال کا جواب نہیں ملا۔ بعض لوگوں نے انہیں یہ رائے دی کہ سرسید کی زندگی میں ان کی لائف لکھنی مناسب نہیں۔ آخر کار حالی نے اپنا یہ ارادہ موقوف کر دیا۔

لیکن حالی کے دل میں ہمیشہ اس کا خیال پیدا ہوتا رہا کہ وہ سرسید کی لائف لکھیں۔ حالی کا اپنا ارادہ موقوف کرنے کے کچھ دنوں کے بعد سرسید کے مخلص دوست حاجی اسمٰعیل خاں کی تحریک سے حالی کے دوست منشی سراج الدین سرسید کی لائف لکھنے پر آمادہ ہوئے۔ انہوں نے پوری کوشش سے اس کے لئے لائق مواد جمع کیا اور ایک خاص حد تک اس کو مرتب کر کے حاجی صاحب کے حوالے کر دیا۔ اس کے بعد کئی برس تک وہ مسودہ پڑا رہا اور چھپ نہ سکا۔

ایک انگریز کرنل گریہم نے اس سے قبل ہی انگریزی میں سرسید کی لائف کو مرتب کر دیا تھا۔ حالی اسی کے متعلق فرماتے ہیں:

> ''تعجب کی بات ہے کہ ایسی قابلِ فخر بائیوگرافی جس کا لکھنا مسلمانوں کا نہایت ضروری فرض تھا اسکے لکھنے کا خیال سب سے پہلے ایک شریف انگریز کو آیا۔ کرنل گریہم نے سرسید کی لائف ان کی وفات سے تیرہ برس پہلے انگریزی میں لکھ کر شائع کر دی اور اس ضروری کام میں سبقت کرنے کا فخر مسلمانوں کے ہاتھ سے جاتا رہا۔[1]''

یہ سب دیکھتے ہوئے حالی کے دل میں جوش پیدا ہوا کہ سرسید کی لائف انہیں کی زندگی میں پورا کر لیں تو اچھا ہوگا۔ اس خیال سے انہوں نے علی گڑھ میں ۱۸۹۴ء میں چند ماہ قیام کیا اور اس وسیع ذخیرہ معلومات سے فائدہ اٹھایا جو وہاں موجود تھا۔ منشی

---

[1] حالی۔ دیباچہ حیات جاوید، دہلی ۱۹۹۰ء، ص ۲۳-۲۲

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

سراج الدین صاحب کا مسودہ بھی حاصل کیا۔ اس کے علاوہ اس وسیع اور مصروف زندگی کے حالات کو جمع کرنے کے لئے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، تہذیب الاخلاق اور سرسید کی جملہ تصانیف کو کھنگالا۔ ان کے خطوط، ان کے دوستوں کے بیانات، انگریزی اخباروں، سرکاری رپورٹوں، موافق و مخالف رسالوں اور بعض مدیران سلطنت کی تحریروں کو پڑھ کر ان سے بھرپور استفادہ کیا۔ انھوں نے گرہم کی کتاب LIFE AND WORK OF SIR SYED AHMAD KHAN سے بھی مدد لی ہے۔ یہ تصنیف ۴۱۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کے علاوہ سیرت فریدیہ سے بھی فائدہ اٹھایا جسے سرسید نے اپنے نانا کے حالات میں مرتب کیا تھا اور ضمنی طور پر اپنے بچپن کے حالات لکھ دیے تھے۔ غرض یہ کہ ایک معاصر ہونے کی وجہ سے حالی کو مواد حاصل کرنے میں زیادہ دشواریاں نہیں جھیلنی پڑیں۔ سب سے زیادہ الجھن اس وقت درپیش آئی جب ترتیب و انتخاب کا مسئلہ آیا جیسا کہ یہ کسی بھی سوانح نگار کے لئے سب سے مشکل مرحلہ ہوتا ہے۔

لیکن سرسید جیسی متنوع شخصیت کی سوانح نگاری کے لئے حالی کو اور بھی کٹھن مراحل سے گزرنا پڑا۔ دیباچۂ حیات جاوید میں وہ رقم طراز ہیں:

> ''اگرچہ سرسید کی لائف کا لکھنا بظاہر ایک آسان کام معلوم ہوتا ہے کیونکہ سنہ ستاون سے لے کر اخیر تک جو کچھ انہوں نے کیا وہ سب چھاپے کے ذریعہ مشتہر ہو گیا ہے اور سنہ ستاون سے پہلے کے حالات بھی معتبر ذریعوں سے معلوم ہو گئے ہیں مگر درحقیقت ان کی تمام سوانح عمری کا سمیٹنا نہایت دشوار کام ہے۔ ان کی زندگی ایسے اہم واقعات سے بھری ہوئی ہے کہ نہ کسی واقعہ کو سرسری سمجھ کر چھوڑا ہی جا سکتا ہے اور نہ ہر ایک واقعہ کو مفصل بیان کیا جا سکتا ہے..... اس سے بھی زیادہ سخت مشکل جو بائیوگرافی کے مضمون سے علاقہ رکھتی ہے یہ ہے کہ سرسید کی ذات میں اس قدر مختلف الجنس حیثیتیں جمع تھیں کہ ہر ایک حیثیت پر اس کی شان اور اس کے درجہ کے موافق گفتگو کرنا ایک

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

ایسا کام ہے جس کا پورا پورا حق وہی مصنف ادا کر سکتا ہے جو خود
بھی سرسید کے برابر جامع حیثیات ہو[1]"

ہم مانتے ہیں کہ حالی کی شخصیت بھی سرسید کی صحبت کے اثر سے ایک جامع الحیثیات شخصیت ہوگئی تھی۔ حالی کو اپنے موضوع سے بے حد لگاؤ اور عقیدت تھی۔ وہ اپنے ہیرو کے مقصد زندگی کو عام کرنے کے لئے فن سوانح کی تمام مشکلات پر عبور حاصل کرنے کے لئے تیار تھے۔ اسی لئے وہ کسی بھی طرح اس کام میں پیچھے نہیں ہٹے اور پوری دیانتداری اور صداقت کے ساتھ اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہونچایا۔ بلاشبہ سرسید کی طرح حالی کی علمی، ادبی، ملکی، اور قومی کارناموں اور ان کی اصلاح سے دلچسپی، سرسید کی رفاقت، سوانحی مواد کی فراوانی، برسوں سے ان کی سوانح عمری لکھنے کی نیت اور سعی ہر چیز انہیں اس کا استحقاق اور موقع فراہم کرتی تھی کہ اسے ایک لازوال شاہکار کی شکل دیں۔ اردو کے ایک عظیم ادیب کو ہندوستان کے ایک عظیم ترین انسان کی سوانح عمری لکھنے کا موقع حاصل ہوا تھا۔ حالی کو کم از کم پچیس سال تک سرسید کی دوستی اور رفاقت کا شرف حاصل رہا۔ انہوں نے سرسید کو نہایت قریب سے دیکھا اور ان کے کارناموں میں ہاتھ بٹایا۔ حالی ایک ادیب ہونے کی وجہ سے سرسید کو ایک باعمل انسان ہونے کی حیثیت سے بے حد پسند کرتے تھے۔ علاوہ بریں حالی اپنی طبعی شرافت، رواداری اور فراخ دلی کی بنا پر دوسروں کی عظمت کا کھلے دل سے اعتراف کرتے تھے اور ان کا انکسار اور ان کا طالب علمانہ جذبہ ہمیشہ دوسروں کو قدر کی نگاہ سے دیکھنے کا باعث ہوتا تھا۔

حالی نے کتاب کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے حصے میں سرسید کی زندگی کے واقعات اور ان کے تمام کام ترتیب وار بقید تاریخ بیان کئے گئے ہیں۔ سرسید کی ولادت، بچپن، خاندان، تعلیم، ابتدائی تصانیف، سرکار انگریز کی نوکری، غدر کی حالت اور اس فتنہ وفساد میں ان کی خدمات، ابتدائی تعلیم، جد جہد ومشاغل، رسالہ اسباب بغاوت ہند کی تکمیل، سائنٹفک سوسائٹی کا قیام، اردو زبان کی حمایت، سفر لندن، سی۔

[1] حالی۔ دیباچہ حیات جاوید، دہلی ۱۹۹۰ء، ص ۲۵

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

ایس۔ آئی کا خطاب، تہذیب الاخلاق کا جاری ہونا، کالج کا افتتاح، تفسیر قرآن، ایجوکیشنل کانفرنس کا قیام، انڈین نیشنل کانگریس کی مخالفت، پارلیمنٹ میں تقاریر اور وفات تک کے واقعات اس حصے میں شامل کئے گئے ہیں اور چھ ابواب میں تقسیم کر کے ان پر بحث کی گئی ہے۔

کتاب کے دوسرے حصے میں سرسید کی ترقی کے اسباب کا جائزہ لیا گیا ہے۔ دراصل یہ حصہ مصنف کی سعی ومحنت کا خلاصہ ہے۔ مصنف نے کمال محنت، لیاقت اور نکتہ سنجی سے سرسید کی شخصیت اور ان کے کارناموں کی تفصیل پیش کی ہے۔ اس حصے میں سرکاری خدمات، پولیٹیکل خدمات، ملکی وقومی خدمات، مذہبی خدمات، سرسید کی مخالفت، کامیابی اور اس کے اسباب، سرسید میں مختلف لیاقتوں کا ہونا، شکل وشمائل، اوضاع وعادات، اخلاقی خصائل اور مذہب جیسے موضوعات قائم کر کے ذیلی عنوانات کے تحت تفصیلی بحث کی گئی ہے۔

کتاب کے پہلے حصے کا پہلا باب ۱۸۱۷ء سے ۱۸۳۸ء تک کے واقعات پر مشتمل ہے جس میں تاریخ ولادت اور خاندان سے لیکر عنفوان شباب تک کے حالات کا ذکر ملتا ہے۔ دوسرا باب (۱۸۳۸ء۔۱۸۵۷ء) ملازمت کے بیان سے شروع ہو کر بجنور میں علاوہ فرائض منصبی کے کمیٹی رفاہ عام کے تمام کام سرانجام کرنے پر ختم ہوتا ہے۔ تیسرے باب (۱۸۵۷ء۔۱۸۶۸ء) میں سب سے پہلے حالی نے ایام غدر کے مصائب اور سرسید کی خدمات کا بیان کیا ہے اور انگریزوں کے ساتھ کھانے سے پرہیز ترک کرنے کے بیان پر اسے ختم کیا ہے۔ چوتھا باب (۱۸۶۹ء۔۱۸۷۰ء) سفر انگلستان سے شروع ہوتا ہے اور اخبار ہم روڈمل میں سرسید کی نسبت ایک آرٹیکل کے ذکر پر ختم ہوتا ہے۔ اس مضمون کے چند فقرے حالی نے درج کئے ہیں۔ پانچویں باب (۱۸۷۰ء۔ ۱۸۷۸ء) میں پہلے سرسید کا ولایت سے ہندوستان واپس پہونچنے کا بیان ہے اور اخیر میں تفسیر القرآن کا ذکر ہے۔ اس حصے کے چھٹویں اور آخری باب (۱۸۷۸ء۔۱۸۹۸ء) میں لجس لیٹو کونسل (Legislative Council) کی ممبری سے لے کر ۲۵ ہزار کا چندہ میموریل کے لئے لکھے جانے تک کا بیان ہے۔ کتاب کا پہلا حصہ ۲۹۸ صفحہ پر ختم ہوتا

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

ہے۔ دوسرا حصہ ۵۶۰ صفحات پر مشتمل ہے۔

یہ تھا کتاب کا مختصر اور سرسری خاکہ جس کے بعد کتاب پر تنقید کی نوبت آتی ہے۔ ضروری ہے کہ سب سے پہلے یہ دیکھا جائے کہ خود حالی کا فن سوانح نگاری کے متعلق کیا نقطۂ نظر تھا۔ یہ جاننے کے لئے ہم دیباچہ حیات جاوید سے ایک اقتباس پیش کرتے ہیں:

''اگرچہ ہندوستان میں جہاں ہیرو کے ایک عیب یا خطا کا معلوم ہونا اس کی تمام خوبیوں اور فضیلتوں پر پانی پھیر دیتا ہے ابھی وہ وقت نہیں ہے کہ کسی شخص کی بائیوگرافی کرنیکل طریقہ سے لکھی جائے۔ اس کی خوبیوں کے ساتھ اس کی کمزوریاں بھی دکھائی جائیں اور اس کے عالی خیالات کے ساتھ اس کی لغزشیں بھی ظاہر کی جائیں۔ چنانچہ اسی خیال سے ہم نے جو دو ایک مصنفوں کا حال اب سے پہلے لکھا ہے اس میں جہاں تک ہم کو معلوم ہوسکیں ان کی اور ان کے کلام کی خوبیاں ظاہر کی ہیں اور ان کے پھوڑوں کو کہیں ٹھیس نہیں لگنے دی۔ لیکن اول تو ایسی بائیوگرافی چاندی سونے کے ملمعے سے کچھ زیادہ وقعت نہیں رکھتی اس کے سوا وہ انہیں لوگوں کے حال سے زیادہ مناسب رکھتی ہے جنہوں نے اس موج خیز اور پرآشوب دریا کے منجدھار میں اپنی ناؤ نہیں ڈالی اور کنارے کنارے ایک گھاٹ سے دوسرے گھاٹ صحیح سلامت جا اترے[1]''

ذرا اور آگے بڑھ کر وہ سرسید کی عظمت بیان کرتے ہیں اور فن سوانح کے سلسلے میں ایک رائے قائم کرتے ہیں:

''وہ ہم میں پہلا شخص ہے جس نے مذہبی لٹریچر میں نکتہ چینی کی بنیاد ڈالی ہے اس لئے مناسب ہے کہ سب سے پہلے اسی کی

---

[1] حالی۔ دیباچہ حیات جاوید، دہلی ۱۹۹۰ء، ص ۲۶

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

لائف میں اس کی پیروی کی جائے اور نکتہ چینی کا کوئی موقع ہاتھ
سے نہ جانے دیا جائے۔ اگرچہ سرسید کے معصوم ہونے کا نہ ہم کو
دعوی ہے اور نہ اس کے ثابت کرنے کا ہم ارادہ رکھتے ہیں لیکن
اس بات کا ہم کو خود بھی یقین ہے اور ہم جانتے ہیں کہ اوروں کو
بھی اس کا یقین دلائیں کہ سرسید کا کوئی کام سچائی سے خالی نہ تھا۔
اور اس لئے ضرور ہے کہ ان کے ہر کام کو نکتہ چینی کی نگاہ سے
دیکھا جائے کیونکہ سچ میں اور صرف سچ ہی میں یہ کرامت ہے کہ
جس قدر اس میں زیادہ کرید کی جاتی ہے اسی قدر اس کے جوہر
زیادہ آب و تاب کے ساتھ ظاہر ہوتے ہیں[1]"

اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حالی سرسید کی سوانح لکھتے وقت الجھنوں اور ذہنی مشکلات میں گھرے ہوئے تھے کیوں کہ ایک طرف وہ زمانے کے تقاضوں کو محسوس کرتے ہوئے کرٹیکل سوانح نگاری سے احتراز کرنا چاہتے ہیں اور اسی وجہ سے انہوں نے حیات سعدی اور یادگار غالب لکھتے وقت محض انکی خوبیوں ہی پر زور آزمائی کی ہے جب کہ ان کی شخصیات بھی ایسا ہی تقاضا کر رہی تھیں۔ لیکن دوسری طرف حالی سرسید کی شخصیت کے انتہائے کمال کے معترف ہیں لہٰذا انہوں نے نکتہ چینی کی ضرورت پر زور دیا اور اس کا دعوی بھی کیا۔ تیسرے سرسید کے کارناموں کی انکی نگاہ میں بڑی اہمیت تھی اور انہیں وہ عوام کے سامنے پیش کرنا بہت ضروری خیال کرتے تھے۔ یہ تمام باتیں حالی کے دماغ میں گونج رہی تھیں اور ایک دوسرے سے ٹکرا رہی تھیں۔ ایسی حالت میں متضاد باتوں سے بچ کر نکل جانا یا کم از کم ان میں الجھ کر نہ رہ جانا بڑی قابلیت کی بات ہے۔ حالی کا معتدل اور متوازن نقطۂ نظر یہاں کام آیا اور ان کے خلوص و دردمندی نے وہ کام انجام دیا جس کا پورا کرنے والا اس وقت کوئی نظر نہ آتا تھا۔ لیکن عملاً دیکھنا یہ ہے کہ تمام اُلجھنوں کے ہوتے ہوئے حالی سوانح نگاری کے اصولوں سے کس طرح سبکدوش ہو سکے ہیں۔ نئی حیثیت سے سوانح نگار کے فن کو پرکھتے

---

[1] حالی۔ دیباچہ حیات جاوید، دہلی ۱۹۹۰ء، ص ۲۷۔۲۶

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

ہوئے یہ دیکھنا چاہیئے کہ اسنے ہیرو کے حالات زندگی قلم بند کرتے وقت دیانت، صداقت کے ساتھ اپنے فرائض کو انجام دیا ہے یا نہیں اور ساتھ ہی تلاش وتحقیق کا کوئی دقیقہ حتی المقدر فروگزاشت تو نہیں کیا ہے۔ ذاتی پسند یا ناپسند اور اپنے معتقدات کو تو جگہ نہیں دی ہے۔ حیات جاوید کو بغور پڑھنے سے یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ حالی نہ تو پوری طرح اپنے دعوے کو پورا کر سکے ہیں اور نہ فنی اعتبار سے پوری طرح کامیاب ہوئے ہیں لیکن سوانح نگاری میں جو مشکلات پیش آئی ہیں وہ ان پیچیدہ راہوں سے ضرور کسی نہ کسی حد تک کامیابی سے گزر گئے ہیں۔ انہوں نے دیانت اور صداقت کا دامن کسی حال میں نہیں چھوڑا لیکن اپنی خواہشات کے مطابق بعض جگہوں پر سرسید کے کاموں کی تاویلیں ضرور کی ہیں۔ کہیں واقعات کو محض سطح پر دیکھا ہے اور کسی جگہ مصلحت کو ضرورت سے زیادہ پیش نظر رکھا ہے۔ اس کے باوجود نہ تو واقعات کو توڑ مروڑ کر پیش کیا ہے اور نہ ہی سرسید کی عظمت کے اعتراف میں بخل سے کام لیا ہے۔ ان میں معاصرانہ رقابت کا نہ تو کوئی جذبہ پیدا ہوا ہے اور نہ ہی انہوں نے خیال آرائی سے کام لیا بلکہ تقاضائے بشریت کے مطابق سرسید کی خوبیاں اور خامیاں دونوں پیش نظر رکھی ہیں۔ مگر ان کے کارناموں کو زیادہ اجاگر کرکے پیش کیا ہے اور خامیوں کی طرف محض اشارے کئے ہیں۔ لوگوں کو یہ اعتراض تھا کہ حالی نے سرسید کی حمایت میں لمبی لمبی تمہیدیں لکھی ہیں اور ان کے کارناموں کو صحیح ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس میں سرسید سے ان کی رفاقت کو ضرور دخل ہے جس کے سبب وہ سرسید کے کاموں کے اور زیادہ قدردان ہوگئے تھے۔ اس قدردانی نے موت کے بعد قومی دل سوزی اور یادِ عزیز کی بھی صورت اختیار کرلی۔ بلاشبہ یہ اعتراض ایک حد تک درست ہے۔ مولانا حالی کی تحریروں میں سرسید کی حمایت کا جذبہ نظر آتا ہے۔ مخصوص حالات کی وجہ سے اس کی ایک حد تک ضرورت بھی تھی لیکن اس کی وجہ سے فن سوانح نگاری کو مجروح نہیں ہونا چاہیئے تھا۔ مجموعی حیثیت سے سرسید کو جس وقار وعظمت کے مرتبے پر بٹھایا گیا ہے وہ ضرور اس کے مستحق تھے۔

سوانح نگاری کی مہم محض علمی لیاقت وصلاحیت کے سہارے طے نہیں کی

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

جا سکتی۔ یہ وہ فن ہے جس کی تکمیل کے لئے جذبۂ ہمدردی اور انس و محبت کی ضرورت ہے جو ہیرو کی کمزوریوں کے اعتراف کے باوجود اسکی عظمت اور شرف و فضیلت کو بھی دیکھ سکے۔ جانسن کے قدردانوں اور دوستوں میں علم و فضل سے مالا مال لوگوں کی کمی نہیں تھی۔ مگر ان میں باسول کے سوا ایسا کوئی نہ نکلا جو جانسن سے سچی محبت کی اس انتہا تک پہونچا ہوا ہو جہاں تک اس کا یہ حقیقی سوانح نگار پہونچ سکا۔ جانسن کے مزاج کی سختی، تندی و تیزی اور اس کی انتہا پسندی غرض اس کی ساری کمزوریاں اس پر روشن تھیں مگر ان سے اس کے انس و عقیدت میں کبھی کوئی کمی نہیں پیدا ہوئی۔ وہ برابر جانسن کی زندگی میں دلچسپی لیتا رہا اور اس کی حرکت و عمل کا جائزہ لیتا رہا۔ اپنی اس دلچسپی اور مستقل مزاجی کے طفیل وہ اپنے ہیرو جانسن کے اصل اور حقیقی روپ کو پیش کر سکا۔ حالی نے بھی جو ہر محبت کی تلاش میں بے حد مشقتیں برداشت کی ہیں۔ سوانح نگاری کی وادی میں قدم رکھنے والے کو جس جوہر کی تلاش ہوتی ہے اس کی قدر و قیمت مادی عظمت کے نقطۂ نظر سے معین نہیں ہوتی بلکہ اس کا معیار بڑی حد تک جذباتی اور معنوی ہوتا ہے۔ ایک سوانح نگار سچی انسانیت کا علمبردار ہوتا ہے اور ایک حد تک خود بھی اسی انسانیت سے متصف ہوتا ہے۔ اسی حوصلہ مندی سے اس میں قلب و نظر کی وسعت ہوتی ہے۔ اسی حوصلہ مندی سے وہ انسانی فضائل کی قدردانی کے قابل ہو کر اس کی کمزوریوں کو سمجھنے اور معاف کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور سب سے آخر میں یہ کہ وہ ایک مشفق ہمدرد، ایک شفیق دوست اور ایک حوصلہ مند رفیق اور قدردان ہوتا ہے کیونکہ وہ اگر ایسا نہیں تو اسے سوانح عمری لکھنے کا اہل نہیں قرار دیا جا سکتا۔ سوانح نگاری کے ان تمام تقاضوں کا بیان ہم پہلے باب میں کر چکے ہیں لیکن یہاں بیان کا مقصد یہ ہے کہ انکی روشنی میں حالی کی سوانح نگاری کو دیکھا اور پرکھا جائے۔ بلاشبہ وہ ایک حقیقی سوانح نگار کی تمام صفات سے متصف تھے اور قدرت کی طرف سے ایک ایسا دل و دماغ لے کر آئے تھے جس میں شریفانہ جذبات، جوہر شناسی، سلامت مزاجی اور انس و محبت کے احساسات بدرجہ اتم موجود تھے۔ انہیں اوصاف کے بنا پر انہیں خوش صفات حالی کا خطاب بھی ملا۔ یہ بالواسطہ اس بات کا اعتراف ہے کہ وہ فطرتاً ان تمام صلاحیتوں کے

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

مالک تھے جو سوانح نگاری کی بنیادی شرائط میں داخل ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ حالی نے کسی معمولی سے معمولی واقعہ کو بھی نظر انداز نہیں کیا اسی لئے کتاب ضخیم بھی ہوگئی ہے۔ یہ بھی واقعہ ہے کہ سیرت کی کتاب ہمیشہ تصنیف سے زیادہ تالیف کا درجہ رکھتی ہے اس لئے یہ اعتراض کہ حیات جاوید تصنیف نہیں تالیف ہے، بالکل بیجا ہے۔ بلکہ حالی کی خاکساری کا یہ عالم تھا کہ وہ اپنی تصنیف کردہ کتاب کو بھی مرتبہ لکھتے تھے۔ اعتراضات کی دنیا میں کبھی بھی کمی نہیں ہوتی۔ بعض حضرات محض مخالفت میں اعتراضات کی بوچھاڑ کر دیتے ہیں۔ ایسے ہی ایک صاحب کا واقعہ مولوی عبدالحق کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں:

> ''جب حیات جاوید شائع ہوئی تو مولانا نے تین نسخے مجھے بھیجے۔ ایک میرے لئے، ایک مولوی عبدالعزیز مرزا کے لئے اور تیسرا ایک محترم بزرگ اور ادیب کے لئے جو اتفاق سے حیدرآباد میں وارد تھے۔ میں نے لے جا کر یہ کتاب ان کی خدمت میں پیش کی۔ شکر یہ تو رہا ایک طرف، دیکھتے ہی فرمایا کہ ''یہ کذب وافترا کا آئینہ ہے'' وہاں اور بھی کئی صاحب موجود تھے۔ میں یہ سن کر دم بخود رہ گیا۔ یوں بھی کچھ کہنا سوء ادب تھا لیکن جہاں پڑھنے سے پہلے ایسی رائے کا اظہار کر دیا ہو وہاں زبان سے کچھ نکالنا بیکار تھا[1]''

اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ ہماری قوم کی اکثریت کے مزاج کو اغراض پسند طبقوں نے شخصیتوں کے معاملے میں نہایت حساس بنا ڈالا ہے۔ ہم دل میں کسی کے لئے عقیدت پیدا کرلیں تو اسے پوجنے کی حد کو جا پہونچتے ہیں اور اس کے برعکس نفرت کرنے پر اتریں تو نہ صرف یہ کہ موت تک اس کا پیچھا نہیں چھوڑتے بلکہ اسکی لاش پر بھی مسلسل لٹھ مار مار کر اپنے جذبات کو تسکین پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہم اس حقیقت کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ اہم اشخاص بھی عام لوگوں کی طرح گوشت پوست

---

[1] مولوی عبدالحق۔ چند ہم عصر، کراچی ۱۹۵۳ء، ص ۱۵۸

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

کے انسان ہوتے ہیں اور ہر انسان خوبیوں اور کمزوریوں کا حامل ہوتا ہے۔

اختلاف رائے کی گنجائش سے کسی کو بھی انکار نہیں ہوسکتا لیکن اختلاف برائے اختلاف ہرگز پسندیدہ نہیں۔ بہت سی نامور ہستیاں بعض معاملات میں ایک دوسرے کی سخت مخالف ہونے کے باوجود عام لوگوں کے لئے قابل احترام ہوتی ہیں۔ مگر یہ عجیب معیار ہے کہ جس شخص کو ہم پسند نہیں کرتے تو وہ جو بھی کہے اس پر غور کئے بغیر اس کے قول کو مردہ ٹھہرایا جائے لیکن وہی بات انہی حالات کے تحت انہی الفاظ میں ہمارا پسندیدہ شخص کہے تو اس کا قول مستحسن قرار پائے بلکہ اس کو ثابت کرنے لئے ہم حقائق کو توڑ مروڑ کر رکھ دیں۔ یوں اپنی نگاہوں میں تو ہم ان شخصیات کے ساتھ عقیدت یا نفرت کے اظہار کی انتہا کر کے سرخ رو ہوجاتے ہیں مگر حقیقتاً ان سے انصاف نہیں کر پاتے۔

سرسید احمد خاں برصغیر میں انیسوی صدی کی ان شخصیات میں سے ہیں جن کی ترجمانی کرتے ہوئے ہم نے حق وصداقت سے کام نہیں لیا۔ اگر ہمیں اپنے نظریہ کے مطابق ان کے بعض اقوال وافعال سے اصولی طور پر اختلاف ہے تو سخن طرازی کے جوہر دکھا کر ان کی ہر اچھی بات کو بھی رد کر ڈالتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ ایک بڑا کام انجام دیا۔ اس کے برعکس اگر ان کے عقیدت مند ہوئے تو حسین الفاظ کی بندش کے ساتھ ان کے ہر کام کی عظمت بیان کر کے یہ خیال کرتے ہیں کہ حق ادا کر دیا مگر اس ادائے حق میں ہم بعض حقائق کو بری طرح مسخ کر کے رکھ دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر جب ہم ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کا ذکر کرتے ہیں تو سرسید کی قومی خدمات کا زمانہ ہمیشہ اس کے بعد سے شروع کرتے ہیں اور خاص اس جنگ کے دوران انہوں نے مسلمانوں کے ضمن میں جو خصوصی ردعمل اپنایا اس کا ذکر ارادتاً گول کر جاتے ہیں۔ حالانکہ سرسید نے اپنی تالیف ''سرکشی ضلع بجنور'' میں اس کا بالتفصیل ذکر بڑے فخر کے ساتھ کیا ہے۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ سرسید اپنی جن خدمات پر عمر بھر فخر کرتے رہے ہم ان کا تذکرہ غالباً اپنی ہتک سمجھتے ہیں۔ اور جس نظریہ کے خلاف وہ آخر دم تک وعظ کہتے رہے انہیں اسی کا خالق قرار دینے لگتے ہیں۔

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

سرسید ایک ادیب، انشاء پرداز، صحافی، سیاستداں، مورخ، فلسفی، عالم دین، مفسر، مفکر، مبصر، مقرر، اور قانون دان ہی نہیں سمجھے جاتے بلکہ ان کا شمار تعلیمی ماہرین میں بھی کیا جاتا ہے۔ علیگڑھ کالج اور سرسید کا نام ہمیشہ لازم وملزوم رہیں گے۔ ان سے منسوب علیگڑھ تحریک ان کی شہرت کو بلند و بالا کرنے کا سبب بنی۔ برصغیر کے مسلمانوں کو ایک خاص نہج پر چلا کر انہوں نے بڑا نام پیدا کیا اور ریفارمر بھی کہلائے۔ وہ ایک باعمل انسان تھے۔ جو کہتے تھے اسے کر کے بھی دکھاتے تھے اور اس سلسلے میں کسی مخالفت کی پرواہ نہیں کرتے۔ اپنے عزائم کی تکمیل کے لئے انہوں نے متنازعہ فیہ شخصیت بننا گوارا کرلیا مگر جو چاہا سو کیا۔ مخالفین کی گھن گرج کے درمیان بھی وہ بڑے اعتماد کے ساتھ اپنے مشن میں ہمہ تن مصروف رہے۔ ان کے بعض کام کسی کی نظر میں کتنے ہی غلط ہوں، ان کی ہمت اور ثابت قدمی کے اصل اسباب ان کے پیچھے وقت کی سیاہ سفید کی مالک ''قوت عظمیٰ'' کا مکمل تعاون ہی کیوں نہ بتایا جائے، مخالفتوں کے شدید طوفان میں قابل رشک جوش وخروش کے ساتھ اپنے کام میں مگن رہنا ان کے عزم وحوصلہ کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔ وہ جس کام کو اپنے طور پر درست سمجھتے تمام رکاوٹوں کو پھلانگتے ہوئے گزرتے۔ خود اعتمادی کا یہ عالم تھا کہ جزئیات کی حد تک بھی اپنی رائے پر وثوق رکھتے، اپنی رائے کی مخالفت میں کسی تجویز کو خاطر میں نہ لاتے اور چٹان کی طرح ڈٹ کر ہمیشہ اپنے ہی منصوبوں کو پایۂ تکمیل تک پہونچانے میں کامیاب ہوتے۔ مختصراً یہ کہ سرسید انیسوی صدی کی ایک ایسی ہنگامہ خیز اور پرعمل مسلسل تحریک کا نام ہے جو مسلمانوں کی قومی بھلائی اور ترقی کے نام ایک مدت تک جاری رہی اور جس نے برصغیر کے مسلمانوں کی اجتماعی زندگی پر نہایت مثبت اور منفی اثرات مرتب کئے۔ حیات جاوید کے ہیرو کی یہ عظمت سوانح نگاری کے فن کے عین مطابق ہے۔

جہاں سرسید کے ذاتی اور خاندانی حالات کا تعلق ہے سردست ہمیں ان سے بحث نہیں ہے۔ مولانا حالی نے ان حالات کو تفصیل سے لکھ دیا ہے سوائے ان چند چھوٹے چھوٹے واقعات اور جزئیات کے جو سرسید کی وفات کے بعد ان کے دوستوں اور مداحوں کے ذریعہ ہم تک پہونچی ہیں اور کوئی قابل ذکر بات ایسی نہیں جو حالی کی

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

حیات جاوید میں موجود نہ ہو۔ حالی کی اس کاوش کے لئے انہیں خراج تحسین پیش کرتے ہوئے قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی رقم طراز ہیں:

> ''سرسید ایک جامع حیثیات شخص تھے اور ان کے حالات زندگی لکھنے میں عموماً ان کی تمام حیثیتوں میں یکسانیت اور ان کے ذاتی خیالات اور ان کی قومی اور مذہبی خدمات کے درمیان ایک خاص ربط ہے جس کو نمایاں کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور یہ ایک سوانح نگار کے لئے بڑا کٹھن مرحلہ ہے۔ اس میں صریحی جنبہ داری اس کی محنت کو برباد کرنے اور سخت تنقید اپنے ہیرو کی تمام خوبیوں کو ملیامیٹ کرنے کے لئے کافی ہے۔ اس لئے مولانا حالی جس دشوار گزار ذمہ داری سے عہدہ برآ ہوئے ہیں وہ یقیناً لائق تحسین اور قابل صد آفریں ہے۔[1]''

جیسا کہ ذکر کیا گیا حالی نے تین سوانح عمریاں لکھیں، حیات سعدی، یادگار غالب، اور حیات جاوید۔ یہ انتخاب خود حالی کے احساسات ور جحانات کا آئینہ دار ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد حیات سعدی کو اول اور یادگار غالب کو آخری درجہ پر رکھتے ہیں۔ غالباً ان کا خیال تھا کہ غالب کی جیسی مکمل اور دلآویز تصویر کی حالی سے توقع کی جاتی تھی وہ ان صفحات میں نہیں ملتی۔ بعض مصنفین نے سوانح نگاری کے فنی مطالبات پر بحث کی ہے اور تصویر کے دوسرے رخ کی کمی کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دی ہے۔ سوانح نگار کے لئے ضروری ہے کہ اپنے مضمون سے اسے گہرا لگاؤ اور ہمدردی ہو۔ کوئی بے تعلق یا مخالف شخص سوانح نگاری کے منصب کی حقیقت کو نہیں سمجھ سکتا۔ جو مصنف اپنے تجربات واحساسات کو بیان کرنے میں دیانت اور سچائی سے کام لیتا ہے وہ سوانح نگاری کا حق ادا کرسکتا ہے۔ حالی کے یہاں دیانتداری بھی تھی اور قلبی لگاؤ بھی۔ انہوں نے بعض کمزور پہلوؤں پر روشنی ڈالنے میں کوتاہی نہیں برتی بلکہ شرافت، متانت اور احترام کا دامن بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ حالی کی ایک بڑی خوبی یہ تھی کہ اپنے ہیرو

---

[1] قاضی احمد میاں اختر۔ سرسید کا علمی کارنامہ، کراچی، ۱۹۶۴ء، ص ۱۳

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

سے متعلق جملہ لٹریچر کا مطالعہ کرتے تھے اور اس میں کبھی تساہل سے کام نہیں لیتے تھے۔ حیات جاوید لکھتے وقت ایک ہم عصر کی سوانح عمری لکھنے میں جتنی دشواریاں پیش آسکتی ہیں وہ سب حالی کو پیش آئیں۔ ایک طرف معاندانہ تبصرے تھے تو دوسری طرف معاصرانہ چشمک۔ حالی نے ان سب سے منھ موڑ کر دیانت داری سے اپنا کام انجام دیا۔

کلی طور پر اگر دیکھا جائے تو حیات جاوید کی جو تصویر حالی نے بنائی ہے اس میں سرسید ایک عام انسان کی مانند پوری طرح ظاہر نہیں ہو سکے ہیں۔ مولانا حالی نے زیادہ تر سرسید کی لکھی ہوئی ''سیرت فریدیہ'' سے ان کے بچپن کی تصویر میں رنگ بھرنے کی کوشش کی ہے۔ کچھ باتیں خود سرسید سے معلوم اور کچھ دوستوں سے معلوم کر کے اور کسی حد تک اپنی ذاتی معلومات کو سامنے رکھ کر اس حصے کو مکمل کیا۔ سرسید سے ان کی قربت اور فن سوانح نگاری کا تقاضا تھا کہ سرسید کی شخصیت سے متعلق معلومات زیادہ ہوں۔ بہت ضروری ہے کہ ہیرو کی عظمت و بزرگی کے اسباب بیان کرنے سے قبل اس کے ذہنی ارتقاء کو تفصیل سے واضح کیا جائے۔ بسا اوقات چھوٹے چھوٹے اور معمولی واقعات پوری زندگی کی نقاب کشائی کر دیتے ہیں۔ حالی نے کہیں کہیں واقعات کی تفصیلات میں اختصار سے کام لیکر فنی کمزری کا ثبوت دیا ہے جب کہ بعض جگہوں پر بظاہر معمولی لیکن حقیقتاً اہم واقعات کو درج کر کے سرسید کی زندگی کو سمجھنے کے لئے موقع فراہم کیا۔ اس سے حالی کی فطرت انسانی سے گہری آشنائی کا پتہ چلتا ہے۔ مثال کے طور پر وہ سرسید کی تعلیم کے ذیل میں بہت اختصار سے کام لیتے ہیں اور بہت ضروری باتوں کا ہی ذکر کرتے ہیں حالانکہ ہم سبھی جانتے ہیں کہ کسی شخصیت کے ذہنی ارتقاء میں تعلیم کا بڑا رول ہوتا ہے۔ حالی کو چاہیئے تھا کہ وہ سرسید کی تعلیمی قابلیتوں اور صلاحیتوں کے مختلف واقعات کو پیش کرتے۔ دوسری طرف وہ سرسید کے عنفوان شباب کے ذکر میں چند چھوٹی اور دلچسپ باتوں کو بھی درج کرتے ہیں۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں:

> ''سرسید جیسے بڑھاپے میں بذلہ سنج تھے جوانی میں اس سے بھی زیادہ ظرافت اور حاضر جوابی ان کی طبیعت میں تھی۔ دلّی میں ایک مشہور طوائف شیریں جاں نامی نہایت حسین تھی مگر سنا ہے

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

کہ اس کی ماں بھدی اور سانولے رنگ کی تھی۔ ایک مجلس میں جہاں وہ اپنی ماں کے ساتھ مجرے کے لئے آئی تھی سرسید بھی موجود تھے اور وہیں ان کے ایک قندھاری دوست بھی بیٹھے تھے۔ وہ اس کی ماں کو دیکھ کر بولے "مادرش بسیار تلخ است" سر سید نے یہ مصرعہ پڑھا "گرچہ تلخ است ولیکن برشیرین دارد[1]"

یوں شخصیت کی مختلف کیفیات کو سمجھنے میں آسانی ہو جاتی ہے اور یہی فنی تقاضا بھی ہے۔ حالی نے سرسید کے بچپن کے حالات میں روایتی طور پر عظمت دکھانے کی کوشش نہیں کی ہے کیونکہ حالی کے نزدیک سرسید میں سوائے جسمانی قابلیت کے شروع میں اور کوئی خاص بات نظر نہیں آتی۔ شیخ عبد القادر اس بات کو نہیں مانتے۔ ڈاکٹر عبدالقیوم ان کی اس رائے کی تائید کرتے ہوئے یہ مثال پیش کرتے ہیں:

"مثلاً اکبر شاہ ثانی کے دربار میں دیر سے جانا اور اصرار کے باجود معذرت کے الفاظ ادا نہ کرنا بلکہ یہی کہتے رہنا کہ میں سو گیا تھا' سرسید کی ذہنی اور افتادِ طبیعت کی طرف اشارہ کرتا ہے جس نے ان میں ایک مسلک پر جمے رہنے کا مادہ پیدا کیا[2]"

دراصل سرسید کی تربیت اور ان کے اخلاق وعادات بلکہ ان کے تمام واقعات زندگی میں ان کی والدہ کا بہت بڑا دخل ہے۔ اسی لئے حالی نے ان کے اس کردار کو قدرے تفصیل سے بیان کیا ہے۔ سرسید نے ایک واقعے کا ذکر کیا تھا جسے حالی درج کرتے ہیں:

"جب میں صدر امین تھا تو اس کے ساتھ میں نے کچھ سلوک کیا تھا اور اس کو ایک سخت مواخذہ سے بچایا تھا مگر ایک مدت کے بعد اس نے در پردہ میرے ساتھ برائی کرنی شروع کی اور مدت تک میری شکایت کی۔ گمنام عرضیاں صدر میں بھیجتا رہا۔ آخر تمام وجہ

---

[1] حالی۔ حیات جاوید، دہلی، ۱۹۹۰ء، ص ۵۸۔۵۷

[2] ڈاکٹر عبدالقیوم۔ حالیؔ کی اُردو نثر نگاری، لاہور، ۱۹۶۴ء، ص ۲۱۸

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

ثبوت جس سے اس کو کافی سزا مل سکتی تھی، میرے ہاتھ آ گئی اور اتفاق سے اس وقت مجسٹریٹ بھی وہ شخص تھا جو اس کے پھانسنے کی فکر میں تھا۔ میرے نفس نے مجھ کو انتقام لینے پر آمادہ کیا۔ میری والدہ کو جب میرا یہ ارادہ معلوم ہوا تو انھوں نے مجھ سے کہا کہ ''سب سے بہتر تو یہ ہے کہ درگذر کرو اور اگر بدلا ہی لینا چاہتے ہو تو اس زبردست حاکم کے انصاف پر چھوڑ دو جو ہر بدی کی سزا دینے والا ہے۔ اپنے دشمنوں کو دنیا کے کمزور حاکموں سے بدلا دلوانا بڑی نادانی کی بات ہے'' ان کے اس کہنے کا مجھ پر ایسا اثر ہوا کہ اس دن سے آج تک مجھ کو کبھی کسی اپنے دشمن یا بدخواہ سے انتقام لینے کا خیال نہیں آیا اور امید ہے کہ کبھی نہ آئے گا بلکہ انہیں کی نصیحت کی بدولت میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ آخرت میں خدا اس سے میرا بدلا لے[1]''

بظاہر ایک چھوٹا سا واقعہ ہے جو سرسید کی والدہ کی نصیحت کے شکل میں ظاہر ہوا ہے لیکن سرسید کی شخصیت کو بنانے اور سنوارنے میں اس کا زبردست رول ہے۔ سرسید نے درگزر کرنے کی صفت کو اپنے اندر اس طرح جاگزیں کر لیا تھا کہ مختلف شعبہ ہائے زندگی میں اس کا اطلاق ہو رہا تھا۔ اس زمانے میں جبکہ سرسید کی بے حد مخالفت ہو رہی تھی، وہ خاموشی سے سب کچھ برداشت کرتے رہے اور کسی سے انتقام تو کیا سب کی خیر خواہی میں لگے رہے۔ معلوم ہوا کہ حالی نے ان گوشوں کو بھی بے نقاب کرنے کی کوشش کی ہے جو سرسید کی ترقی اور نشو و نما میں بے حد ممد و معاون ثابت ہوئے تھے۔

حالیؔ کی سوانح نگاری کے معترضین میں شبلی سب سے بڑے معترض کی حیثیت سے ہمارے سامنے آتے ہیں۔ اگر بغور دیکھا جائے تو یہ اعتراضات حالی کے ہیرو سرسید سے تعلق رکھتے ہیں۔ شبلی اپنے ایک دوست کو خط میں لکھتے ہیں:

''حیات جاوید میں مولانا حالی نے سید صاحب کی یک رخی تصویر

---

[1] حالی۔ حیات جاوید، دہلی، ۱۹۹۰ء صفحہ ۴۶

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

دکھائی ہے۔ اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ کسی کے مصائب دکھانا تنگ خیالی اور بد طینی ہے لیکن اگر یہ صحیح ہو تو موجودہ یوروپ کا مذاق اور علمی ترقیاں سب برباد ہو جائیں پھر ایشیائی شاعری میں کیا برائی ہے سوائے اس کے کہ وہ محض دعوی کرتے تھے، واقعات کی شہادت پیش نہیں کرتے تھے۔ بہر حال ''حیات جاوید'' کو مدلل مداحی سمجھتا ہوں [1]''

شبلی نے اسی پر بس نہیں کیا بلکہ ایک دوست کو پھر لکھتے ہیں:

''اختلاف آرا بھی کیا چیز ہے۔ حیات جاوید کو میں لائف نہیں سمجھتا بلکہ کتاب المناقب سمجھتا ہوں اور وہ بھی غیر مکمل۔ خیر الناس فیما یعشقون مذاهب [2]''

شبلی کے ان اعتراضات کا ذکر کر کے مہدی بڑی دیانتداری سے حقائق کی روشنی میں ان کا جواب دیتے ہیں۔ ان کی بعض باتیں قابل ذکر ہیں جو ایک اقتباس کی شکل میں یہاں درج کی جارہی ہیں:

''اسی طرح حالی کی یہ صنعت گری جہاں یورپ کے طرز تحریر سے ماخوذ بتائی گئی ہے شبلی یہ بھی فرماتے ہیں کہ اس پر فریب طریقہ سے جو ایشیائی شاعروں سے ملتا جلتا ہے ''موجودہ یورپ'' کا مذاق اور علمی ترقیاں سب برباد ہو جائیں گی، لٹریچر کی طرف سے اس فی الوقت دقیقہ رسی اور جوش التفات کا شکریہ لیکن ایک نکتہ داں یہ سوال پیدا کر سکتا ہے کہ جس خطرے کا احتمال ظاہر کیا گیا اس کے لحاظ سے مغربی زبان کی کوئی سوانح عمری ایسی دکھائی جا سکتی ہے جس میں محاسن کے ساتھ معائب ابھار کر دکھائے گئے ہوں۔ کم سے کم جتنی مستند کتابیں سیرت (لائف) کی حیثیت

---

1. مہدی افادی۔ افادات مہدی، ۱۹۲۳ء، ص ۳۲۱
2. ایضاً ,, ,, ,, ,,

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

سے انگریزی زبان میں لکھی گئی ہیں وہ ڈاکٹروں کے دائرۂ نظر میں ہوں گی لیکن افسوس ہے کہ حیات جاوید کی طرح کسی کتاب سے مولانا کی توقعات پوری ہوتی معلوم نہیں ہوتیں یعنی ان میں ایسے مستقل ابواب نہیں ملتے جن میں کہ از قوام جرائم پیشہ یا ''باب اشرار'' کے عنوان سے کسی شخص کے حفظ غیب کا غیر ضروری خاکہ اڑایا گیا ہو[1]''

دوسری بات یہ کہ شبلی جو فن سوانح نگاری کے لحاظ سے حیات جاوید پر سخت نکتہ چینی کرتے ہیں، یہ بات قابل غور ہے کہ خود انہوں نے اپنی تصانیف المامون، سیرت النعمان، الفاروق اور الغزالی میں انسانی کمزوریوں کو کس حد تک ابھار کر دکھایا ہے۔ بالحقیقت ان سوانحوں میں شخصیت کے دوسرے رخ کی کمی کھٹکتی ہے اور وہی اعتراض جو انہوں نے حالی پر کیا ہے خود ان کے اوپر صادق آتا ہے۔ مہدی افادی نے حیات جاوید پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا ہے:

''حیات جاوید کے لئے حالی کی طرف سے اعتذار (اپالوجی) کی بالکل ضرورت نہیں۔ ایک شریف نے ایک شریف تر انسان کی ہمدردانہ سرگزشت لکھی اور آشنائے فن ہو کر لکھی ہے اور یہی اونچے سے اونچا معیار تحریر ہے جو ایمان بالغیب کی حیثیت سے یوروپ کی طرف منسوب کیا جا سکتا ہے۔ یہ قطعی ہے کہ حیات جاوید کا رئیس التذکرہ فرشتہ نہیں تھا، انسان تھا لیکن اس کے اخلاقی اوصاف اس کی اضطرابی لغزشوں پر جنہیں انسانی کمزوری سمجھئے غالب تھے۔ یہی مابہ الامتیاز ہے جس کے بنا پر سوانح نگار کسی بڑے سے بڑے شخص کو دنیا کے سامنے پیش کر سکتا ہے۔ سرسید کی کمزوریاں جن کی بے نقابی پر شبلی کو اس قدر اصرار ہے اور جن کے اظہار میں حالی نے صرف بے دردی سے کام نہیں لیا

---

[1] مہدی افادی۔ افادات مہدی، ۱۹۲۳ء، ص ۳۲۲

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

دراصل سرسید کی زندگی کے دو عناصر ہیں جن کے بغیر انسانی اخلاق کی تکمیل ناممکن ہے لیکن اس قسم کی اضافی تصریحات کا بے ضرورت پھیلانا اور تنقیص پہلو کا اس طرح نمایاں کرنا کہ اصل محاسن دب جائیں بالکل ایسا ہی ہوگا جس طرح ''ندوہ'' کے آخری مناقشات کو شبلی کی ادبی زندگی سے وابستہ کیا جائے جس پر مولانا کا سوانح نگار کبھی راضی نہیں ہوگا اور جسے شبلی کی علمی نفسیت (سائیکلوجی) سے دراصل کوئی تعلق نہیں ہے[1]''

صالحہ عابد حسین نے بڑے ٹھنڈے دل اور صاف گوئی سے شبلی کے اعتراض کا جواب دیا ہے جو ہماری ناچیز رائے کے مطابق صداقت پر منحصر ہے۔ ملاحظہ ہو:

''لیکن ان کا منشا محض سرسید کے ''فضائل ومناقب'' بیان کرنا اور مدلل مداحی نہیں تھا جیسا کہ بعض لوگوں نے کہا ہے۔ بلکہ حالی نے پوری ایمان داری اور صداقت کے ساتھ سرسید کی خوبیاں اور کمزوریاں دکھائی ہیں اور ان کے کاموں کو تنقیدی نظر سے پرکھا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ انسان کو اپنے عزیز یا دوست کی کمزوریاں ذرا مدھم اور خوبیاں زیادہ نمایاں نظر آتی ہیں۔ اس لئے اگر حیات جاوید میں سرسید کی تعریف کا پہلو ضرورت سے زیادہ بھاری معلوم ہوتا ہے تو مقام تعجب نہیں۔ جہاں تک عمداً مدلل مداحی کا سوال ہے، حالی کی تمام ادبی زندگی اور سیرت کی داخلی شہادت اس کے خلاف ہے۔ حالی نے علمی دنیا اور عملی زندگی دونوں میں عمر بھر دیانتداری، انصاف پسندی اور صداقت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا اس لئے یہ کسی طرح قرین قیاس نہیں معلوم ہوتا کہ انہوں نے سرسید کے لئے جو کچھ لکھا اس میں حقیقت کی طرف پوری توجہ نہیں کی ہے[2]''

---

[1] مہدی افادی۔ افادات مہدی، ۱۹۲۳ء، ص ۲۳۔۳۲۲

[2] صالحہ عابد حسین۔ یادگار حالی، علی گڑھ، ۱۹۵۰ء، ص ۲۴۲

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

یہاں یہ واضح کرنا ضروری ہے کہ حالی وشبلی کی جس معاصرانہ چشمک کی بات ہم نے کی ہے وہ محض ادبی حیثیت سے تھی۔ نجی زندگی میں دونوں علماء کے تعلقات بہت خوشگوار تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ حالی شبلی کے بزرگ تھے اور شبلی نے ہمیشہ انہیں عزت کی نگاہ سے دیکھا۔ سید شاہ علی کی یہ بات بالکل صحیح معلوم ہوتی ہے کہ ان کی چشمک دراصل سرسید سے تھی۔ حیات جاوید پر نکتہ چینی فی الحقیقت ان کی سرسید سے رشک ورقابت اور ہم چشمی بلکہ دعویٰ برتری کا نتیجہ ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ شبلی نے حالی کی حیات سعدی کو ایک دلچسپ، محققانہ اور بے مثل سوانح عمری قرار دیا ہے۔ یادگار غالب کو اردو کی ایک بہترین سوانح عمری بتایا ہے حالانکہ حالی نے اپنی پہلی سوانح عمریوں کے یک طرفہ ہونے کا اعتراف خود حیات جاوید کے دیباچے میں کیا ہے۔ ابتدا میں دیئے گئے اقتباس میں اس کا ذکر ہے۔ لیکن شبلی نے حیات جاوید پر کم از کم نصف درجن سخت سے سخت الفاظ میں اعتراض کیئے ہیں۔ حالانکہ محمد حسین آزاد کی ''سخندان فارس'' پر شبلی کی تنقید میں یہ تلخی نہیں اور نہ شبلی کی کسی اور معاصری تصنیف میں تنقید کا یہ لب ولہجہ ہے۔ شبلی کی سرسید سے یہ چشمک محض یک طرفہ معلوم ہوتی ہے۔ سرسید نے ہمیشہ ان کی حوصلہ افزائی کی جس کا اعتراف خود شبلی نے اپنے خطوط میں کیا ہے۔ شبلی نے الکلام لکھی لیکن سرسید کا نام تک نہیں آیا۔ حیات جاوید کے سلسلے میں گو وہ ایک حد تک صحیح ہی کیوں نہ ہوں اعتراضات کا بار بار کا لب ولہجہ آخر کار ان کی بدنیتی پر دال ہے۔ اگر وہ حق گو تھے تو انہوں نے سرسید کی سوانح عمری لکھنے سے پہلو تہی کیوں کی۔ حیات جاوید سے اچھی تو دور کی بات ہے اگر وہ اس جیسی بھی سرسید کی سوانح لکھ دیتے تو اردو دنیا ان کے اعتراضات کی معترف ہو جاتی اور ان کی قابلیت وصلاحیت کی داد دیتی۔

علامہ شبلی کے فاضل دوست حبیب الرحمٰن خاں شیروانی نے اس ادبی مباحثہ میں اپنی دوستی کا حق ادا کر دیا ہے اور حیات جاوید کے دونوں حصوں پر یکے بعد دیگرے تقریباً نو اعتراضات وارد کیئے ہیں۔ حیات جاوید پر ان کا تبصرہ پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے حیات جاوید پڑھنے سے قبل ہی خامیوں کی جستجو شروع کر دی ہوگی اسی وجہ سے انہیں کتاب میں کوئی خوبی نظر نہیں آتی۔ ہر حالت میں انہوں نے پہلے ہی

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

صاحب سوانح اور موضوع سوانح کو لتاڑنے کا موڈ بنالیا تھا۔ ورنہ وہ اس کتاب کی حقیقی خوبیوں کو کبھی نظر انداز نہیں کر سکتے تھے۔ سب سے پہلے انہوں نے سرسید کی تصنیف کردہ تفسیر القرآن پر اپنا اعتراض وارد کیا۔ حالی نے بڑے صدق دل سے کہا تھا کہ مفسر کے بیان میں ممکن نہیں کہ لغزشیں نہ ہوئی ہوں۔ اس پر شیروانی صاحب فرماتے ہیں

> ''یہ کسی جگہ مثلاً بھی نہیں بتایا گیا کہ فلاں فلاں مقام پر لغزشیں ہوئی ہیں[1]''

یہ صحیح ہے کہ حالی نے یہ غلطی کی لیکن اگر وہ لغزشوں کی نشاندہی کرتے تو دلائل سے ان کو ثابت کرنے کی ضرورت ہوتی جس سے مزید طوالت کا خدشہ تھا۔ دوسرے یہ کہ یہ کام کسی سوانح نگار کا نہیں بلکہ مفسر القرآن کا ہے کہ تفسیر کی خوبیوں اور خامیوں کو دلائل کے ساتھ واضح کرے۔ سوانح نگار کا کام محض حقائق کا بیان ہے۔ یہ کیا کم ہے کہ حالی جیسے سرسید کے عقیدت مند نے ان کی لغزشوں کا اعتراف کرلیا ہے۔ مولانا شیروانی نے بعض لغزشوں کی نشاندہی تو کی ہے لیکن دلائل کی زحمت گوارہ نہیں کی۔

مولانا شیروانی نے اپنے تبصرے میں یہ سوال اٹھایا ہے کہ سرسید کو تفسیر لکھنے کا بھی حق تھا یا نہیں اور مولف حیات جاوید کی مدد سے بہت سے اعتراضات کئے ہیں۔ مثلاً حالی کے حوالے سے لکھا ہے۔:

> ''سرسید کی تعلیم بہت محدود تھی پھر فن تفسیر کی ایک سطر بھی ان کی درسی کتابوں میں شامل نہیں ہے اور اس بات کا پتہ بھی نہیں چلتا کہ کوئی زمانہ فن تفسیر کے مطالعہ میں صرف کیا ہو یا تفسیر کا باقاعدہ مطالعہ کیا ہو۔ پھر ان کے پاس ہمیشہ ایک اسسٹنٹ روایت کشی کے واسطے رہا[2]''

یہ صحیح ہے کہ سرسید نے باقاعدہ تفسیر نہیں پڑھی اور تفسیر لکھی لیکن دنیا میں اور بھی اس کی مثالیں ملتی ہیں مثلاً گلیڈ اسٹون نے بائبل پر ایک کتاب لکھی حالانکہ وہ

---

[1] محمد حبیب الرحمان خاں شیروانی۔ مقالات شیروانی، مرتب وطابع محمد مقتدی خاں شیروانی ۱۹۴۶ء، ص ۶۸

[2] محمد حبیب الرحمان خاں شیروانی۔ مقالات شیروانی، مرتب وطابع محمد مقتدی خاں شیروانی ۱۹۴۶ء، ص ۵۶۔۵۴

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

ایک لفظ عبرانی (Hebrew) کا نہیں جانتا تھا۔ سرسید ایک عالم دین تھے اور یہ حقیقت ہے کہ وہ عربی زبان کے تمام رموز ونکات سے واقف تھے۔ گرچہ انہوں نے عربی لٹریچر کی تعلیم مکمل نہیں کی لیکن ان کے ذاتی مطالعے اور غیر معمولی صلاحیت نے ساری مشکلوں کو آسان کر دیا تھا۔

مولانا شیروانی کا یہ کہنا کہ مولانا حالی کا سارا زور سرسید کی حمایت میں صرف ہوا ہے، کسی طرح درست نہیں۔ انہوں نے مولانا وحید الدین سلیم ایڈیٹر معارف علی گڑھ پر بھی جانب داری کا الزام لگایا تھا۔ جہاں تک حالی کی فطرت کا تعلق ہے ان سے کسی معاندانہ رویے کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔ مزید سوانح نگار کا یہ کام بھی نہیں ہے کہ وہ خواہ مخواہ اپنے ہیرو کی عظمت بڑھانے کے لئے دوسروں کی تحقیر کرے یا انہیں پست دکھائے۔ کم از کم حالی کا یہ شعار نہ تھا البتہ بعض جملے بہ تقاضائے محبت اور مصلحت ان کے قلم سے حمایت میں ضرور نکل گئے ہیں اور درمیان میں واقعات کی چند کڑیاں ٹوٹ گئی ہیں جس سے غلط فہمی کا امکان پیدا ہو گیا ہے۔ دراصل حالی نے تفصیل سے گریز کرتے ہوئے نتائج سے بحث کی ہے جس سے تھوڑی تشنگی معلوم ہوتی ہے لیکن بددیانتی کا الزام نہیں عائد کیا جاسکتا۔ زیادہ سے زیادہ یہ اعتراض کیا جاسکتا ہے کہ حالی نے جو رائے دی ہے وہ واضح اور صائب نہیں ہے۔

مولانا شیروانی نے کتاب کے پہلے حصے پر متعدد اعتراضات کیے ہیں۔ ان کے یہ اعتراضات انہیں کے الفاظ میں پیش ہیں:

> ''حیات جاوید میں بعض فروگزاشتیں قابل لحاظ رہ گئی ہیں مثلاً حلیہ میں ناک کے بھاری پن کا ذکر نہیں حالانکہ ایک مدبر کے حلیہ کا یہ ایک ضروری جز ہے۔ سرسید کی شادی کا ذکر نہیں۔ احباب کے بیان میں یہ ذکر نہیں کہ سرسید نے احباب کس طرح پیدا کئے۔ نواب محسن الملک کا ابتداءً بقصد جنگ آنا اور پھر سرسید کے سامنے ہتھیار ڈال دینا ایک دلچسپ واقعہ ہے۔ اسی طرح اور دوستوں کے بھی ابتدائی حالات ہوں گے۔ اس ذکر کے لکھنے

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

کی ہی وجہ سے بھی ضرورت تھی کہ اس عہد میں لیڈر بننے کا سودا ہر دماغ میں ہے مگر ان صفات سے لوگ عموماً بے خبر اور بے بہرہ ہیں جو ایک آدمی کو لیڈر بنا دیتی ہیں۔[1]''

جیسا کہ ذکر کیا جا چکا ہے فنی اعتبار سے یہ حصہ تشنہ ہے۔ درحقیقت اس میں حالی کے اس مزاج کو زیادہ دخل ہے جو ہر چیز کو مقصدیت کی روشنی میں دیکھنے کا عادی ہو چکا ہے۔ حالی کارناموں پر زیادہ زور دیتے تھے۔

مشیر احمد علوی ناظر کاکوروی اپنی کتاب ''علی گڑھ تحریک اور ادب اُردو'' میں دور جدید کے چند ممتاز افراد کے حیات جاوید پر اعتراضات کا ذکر کرتے ہیں۔ اس میں انھوں نے کل نو اعتراضات کا اندراج کیا ہے جو حسب ذیل ہیں:

۱۔ ''حالی نے کرنل گریہم اور مولوی سراج الدین ایڈیٹر ''چودھویں صدی'' کے مسودوں کو دیکھ کر حیات جاوید لکھی اس لیے کوئی ندرت نہیں ہے، مسالہ موجود تھا صرف انھوں نے ایک جگہ اپنے مخصوص طرز انشاء میں پیش کر دیا ہے۔''

۲۔ ''اس قدر ضخیم ہے کہ اس میں رطب و یابس سبھی کچھ جمع ہو گیا ہے اور حقائق نظر انداز ہو گئے ہیں۔''

۳۔ ''اکثر واقعات مختلف شکلوں میں اس کتاب میں مختلف حالات میں موجود ہیں۔ اس سے ادبی حسن زائل ہو گیا ہے۔''

۴۔ ''اکثر واقعات کا بار بار اعادہ کیا گیا ہے۔ اس لیے دماغ پر اس کا مطالعہ بار ہوتا ہے۔''

۵۔ ''اکثر واقعات قصداً نظر انداز کر دیے گئے ہیں مثلاً سید احمد کی دماغی نشو و نما پر کافی بحث نہیں کی گئی ہے۔''

۶۔ ''سید احمد کی تصویر زیادہ تفصیل و تحقیق کی محتاج تھی۔ موجودہ تصویر نامکمل ہے۔''

۷۔ ''حیات جاوید تذکرہ سے زیادہ منقبت کی کتاب نظر آتی ہے۔''

۸۔ ''حیات جاوید'' سید احمد کی بے راہ زندگی کا اعتذار کہی جا سکتی ہے۔''

---

[1] محمد حبیب الرحمان خاں شیروانی۔ مقالات شیروانی، مرتب و طابع محمد مقتدی خاں شیروانی ۱۹۴۶ء، ص ۶۸

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

۹۔ ''سید احمد کے مذہبی نظریات، سید محمود کے معاملہ میں کمزوری کا اظہار، ان کے مخالفین کی برائیاں، کانگریس سے علیحدگی وغیرہ صدہا ایسے واقعات تھے جو قصداً حالی نے مصلحتاً نظر انداز کر کے ''حیات جاوید'' کی ادبی حیثیت کو زائل کر دیا۔''

مذکورہ مصنفین مندرجہ بالا اعتراضات کے جوابات دینے سے احتراز کرتے ہوئے محض یہ کہنے پر اکتفا کرتے ہیں کہ:

> ''الزامات کی ایک طویل فہرست تھی جو حالی پر دور حاضر کے ناقدین نے عائد کئے ہیں۔ جوابات اس کے بہت آسانی سے دیئے جاسکتے ہیں لیکن سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ ناقدین کرام خود حیات جاویدی ایک معیاری تصنیف تیار کر کے ملک کے سامنے پیش کر دیں تو حقیقتاً یہ بڑی ادبی خدمت ہوگی۔ ایک چراغ سے سینکڑوں چراغ جلتے ہیں۔ حالی کے ادبی وقار کو اس جدید قالب سے کوئی نقصان نہ ہوگا۔ اعتراضات کرنا بڑا آسان ہے۔ جس ماحول اور جس مخصوص فضا میں یہ کتاب تیار کی گئی اس کو لوگ جوش تنقید میں اکثر فراموش کر دیتے ہیں[1]۔''

ایک ضروری سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کتاب میں سرسید کی جو تصویر پیش کی گئی ہے کیا وہ ان کی مکمل تصویر ہے۔ جہاں تک شخصیت کے خارجی واقعات کا تعلق ہے حالی نے ان کو جامع انداز میں بیان کیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ شخصیت کے ساتھ ساتھ اس کی نفسیات بیان کرنے سے اکثر قاصر رہے ہیں۔ اس میں سرسید کے مشن، ان کے کارناموں، ان کی خدمات اور ان کے مشاغل و فرائض پر ایک مفصل تبصرہ تو ضرور ملے گا لیکن بشریت کے خدوخال نمایاں کرنے کی بہت کم کوشش ہے۔ شاید حالی نے اس کی طرف توجہ کم اس وجہ سے دی کہ اس میں انھیں چالیس برس تک کوئی کرشمہ نظر نہیں آیا جیسا کہ دوسری بڑی شخصیات میں ابتدا ہی سے کرشمات جھلکنے لگتے ہیں۔ حالی دیباچے کے اخیر میں قارئین کی توجہ مبذول کرتے ہوئے کہتے ہیں:

---

[1] مشیر احمد علوی ناظر کا کوروی۔ علی گڑھ تحریک اور ادب، پٹنہ، ۱۹۹۹ء، ص ۸۵۔۸۴

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

''اب دیباچہ کو ختم کرتے ہیں اور ناظرین کی خدمت میں التماس کرتے ہیں کہ کتاب کے مطالعہ کے وقت اس بات کا خیال رکھیں کہ دنیا میں بڑے سے بڑے آدمیوں کی زندگی بظاہر اس طرح شروع ہوتی ہے جس طرح عام آدمیوں کی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ اس میں کوئی کرشمہ ایسا صاف اور صریح نظر نہیں آتا جس سے ان کی آئندہ زندگی کی عظمت کا سراغ لگ سکے لیکن جب ان کی اعلیٰ قابلیتوں کے جوہر بتدریج اپنے اپنے موقع پر ظاہر ہوتے ہیں اس وقت معلوم ہو جاتا ہے کہ جو معمولی باتیں ان کی ابتدائی حالت میں ناچیز اور کم وزن نظر آتی تھیں وہی ان کی آئندہ ترقیات کی بنیاد تھیں پس اس معزز لائف کی وہ عظمت جس کی طرف دیباچہ میں اشارہ کیا گیا ہے، آغاز کتاب میں ڈھونڈنی نہیں چاہیے بلکہ اس موقع کا منتظر رہنا چاہیے جہاں سرسید کی ترقی کے اسباب بیان کئے گئے ہیں اور دکھایا گیا ہے کہ جو کچھ ان سے چالیس برس بعد ظہور میں آیا وہ اس کے لیے بچپن ہی سے تیار ہو رہے تھے[1]''

بظاہر اس کا دوسرا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ حالی یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ سید احمد خاں کہاں تک اپنے مشن میں حق بجانب تھے اور کہاں تک اس میں کامیاب ہوئے۔ چونکہ بشریت کا بے نقاب کرنا نہ ان کے مقاصد میں تھا اور نہ انھوں نے اس کی کوشش کی۔ حالی کا جو غایت اصلی تھا وہ اس میں کامیاب ہیں۔ ڈاکٹر سید عبداللہ کا خیال ہے کہ:

''اگرچہ ہم ضرورت سے زیادہ یوروپ اور ان کے اصول تنقید کی نقالی کو پسند نہیں کرتے لیکن بہ ایں اعتبار کہ خود حالی نے خود اس طرز سوانح نگاری کو سراہا ہے یہ کہنا بے جا نہیں کہ انگریزی زبان

---

[1] حالی۔ دیباچہ حیات جاوید، دہلی ۱۹۹۰ء، ص ۲۹

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

کی بعض عمدہ سوانح عمریوں میں بڑے بڑے ہنگاموں اور معرکوں کی زندگی کے بین سطور میں مصنفین کو ''بشریت'' کی جو رنگینیاں نظر آئی ہیں اور بشری محاسن و مصائب کے جو خصائص ان کو مل سکے ہیں وہ انھوں نے بلا تکلف اپنی بیاگرافیوں میں درج کرتے ہوئے اپنے موضوع کی ''شخصی'' اور ''ذاتی'' زندگی کو زیادہ نمایاں کیا ہے[۱]''

حیات جاوید میں دلچسپ ذاتی اور بشری جزئیات کا ذکر بہت کم کیا گیا ہے حالانکہ ان کے ذریعے سوانح کو پرلطف بنایا جا سکتا تھا۔ لوکہارٹ کی ''لائف آف اسکاٹ'' اور باسول کی ''لائف آف جانسن'' کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ان میں روزمرہ کے معمولی واقعات سے زندگی کے خاکے میں خوبصورت رنگ بھرا گیا ہے لیکن حالی کی کتاب ان بیل بوٹوں سے بہت حد تک خالی ہے۔ بچپن کے مطابق جو کچھ لکھا گیا ہے یا شاید عنفوان شباب کا حال بے شک پرلطف ہے۔ اخلاق و عادات اور طرز تصنیف و تالیف کا باب دلکش ہے۔

سید عبداللہ نے سرسید کی زندگی کے بعض ان واقعات کا ذکر کیا ہے جن سے ان کی ذات ہمیشہ سے بدگمانیوں اور غلط فہمیوں کا محل بنی ہوئی ہے۔ حیات جاوید کی تاویلات و توضیحات کے باوجود اب بھی عوام میں غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں۔ ان کے درج کردہ اختلافی مسائل حسب ذیل ہیں[۲]:

۱۔ ایام غدر میں سید صاحب کا طرز عمل

۲۔ سید صاحب کا مغربی تمدن کو پسند کرنا اور اس کے بعض پہلوؤں کو اختیار کر لینا۔

۳۔ سید صاحب کا مذہب کو معقولات کے تابع کر دینا اور بعض ایسے عقاید کا انکار جو مسلمات میں سے تھے اور بعض کا اقرار جو دین میں پہلے موجود نہ تھے۔

---

۱ سید عبداللہ۔ فروغ اردو حالی نمبر حصہ دو لکھنؤ جون ۱۹۵۹ء ، ص ۳۸۴

۲ سید عبداللہ۔ فروغ اردو حالی نمبر حصہ دو لکھنؤ جون ۱۹۵۹ء ، ص ۳۹۰

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

۴۔ سید صاحب کا آخری عمر میں سید محمود کے ہاتھوں میں کھیلنا اور پرانے رفقاء سے اختلاف ٹرنٹی بل کے واقعات۔

۵۔ سید صاحب کا انڈین نیشنل کانگریس سے الگ رہنا اور مسلمانوں کے لیے الگ سیاسی حکمت عملی کا وضع کرنا۔

سید عبداللہ نے مندرجہ بالا امور کا اختصار کے ساتھ جائزہ لیتے ہوئے حیات جاوید میں مذکور حالی کی آراء پر تنقید کی ہے۔ بعض جگہوں پر وہ مصنف سے اتفاق کرتے ہیں اور بعض مقامات پر انھیں تنقید کا نشانہ بناتے ہیں۔ مثلاً وہ مولانا حالی کی اس رائے سے اتفاق کرتے ہیں کہ ایام غدر میں سید صاحب نے عاقبت بین کے خیال سے نہایت دیانتدارانہ یہی ضروری سمجھا کہ باغیوں کی مخالفت کی جائے۔ سرسید نے مغرب اور مغربی تمدن سے محبت اور اس سے وابستگی کی وجہ سے جو ''لباس وطعام و مکان اور طرز ماندو بود اور طرز معاشرت'' وغیرہ انگریزی طریقے پر اختیار کرلیا تھا حالی اس کو ''تعلیم یافتہ ترکوں کا طریقہ'' کہتے ہیں۔ حالانکہ حیات جاوید میں ترکوں کی محبت کی کوئی اور مثال نہیں ملتی۔ سید عبداللہ کے مطابق

> ''یہ اس بات کی شہادت ہے کہ ہیرو کے بعض عیوب یا بعض خصائص کو اچھے رنگ میں پیش کیا گیا ہے۔''(۱)

جہاں کہیں مولانا حالی نے کسی کمزوری کا ذکر کیا ہے اس کے بعد ''لیکن'' لکھ کر کمزوری کو محاسن میں تبدیل کرنے کی کوشش کی ہے۔ سید صاحب کے اکثر اجتہاد سے حالی کو اختلاف تھا اور ان کے نزدیک سرسید غلطی پر تھے لیکن اس کو ظاہر کرنے میں چشم پوشی کو روا رکھا گیا ہے۔ حیات جاوید میں جو پاس ادب ملحوظ ہے وہ دراصل مشرقی عقیدت اور خاطر داری کا پہلو لئے ہوئے ہے۔ مولانا حالی پر بحیثیت سوانح نگار یہ اعتراض بجا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے سرسید کو مختلف معاملات میں حق بجانب ٹھہرانے کے لیے جو تاویلات پیش کی ہیں یہ کام ان کے فرائض سے خارج تھا۔

حالی حیات جاوید میں سرسید کو بحیثیت مصلح، مجدد یا ریفارمر اتنی اونچائی پر

۱۔ سید عبداللہ۔ فروغ اردو حالی نمبر حصہ دوم، لکھنؤ جون ۱۹۵۹ء، ص ۳۹

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

بٹھاتے ہیں کہ وہ علماء سلف کے کارناموں کو ٹھکرا دیتے ہیں۔ وہ سرسید کی محبت کے جوش میں یہاں تک کہہ گئے کہ:

''علمائے سلف میں سے کسی شخص نے عام اصلاح کا ارادہ نہیں کیا[۱]''

حالانکہ مسلمانوں کی پوری تاریخ اس کی تردید کرتی ہے۔

اس کتاب میں سرسید کے ساتھ قوم کی ذہنی زندگی کی پوری تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ سید عبداللہ نے مقدمہ حیات جاوید میں لکھا ہے:

''یہ سرسید کی لائف ہی نہیں بلکہ ہندوستان کی ایک ہنگامہ خیز صدی کی تاریخ بھی ہے۔ ابتدائی خاندانی حالات سے لے کر یوم وفات تک ہمارا مصنف ہر جگہ اور ہر مقام پر اپنے ہیرو کے ساتھ ساتھ گھومتا نظر آتا ہے۔ وہ سرسید کی حد درجہ مصروف زندگی کے کسی کارآمد لمحے میں ان کا ساتھ نہیں چھوڑتا[۲]''

اور آل احمد سرور بڑے جامع انداز میں بیان کرتے ہیں کہ:

''اس میں صرف سرسید کی نہیں بلکہ پوری قوم کی ذہنی تاریخ آ گئی ہے۔ حالی نے تمام مواد کو سمیٹنے اور مرتب کرنے میں بڑی قابلیت دکھائی ہے۔ ان کا یہ خیال کہ سرسید کے تمام کاموں کا محرک مذہبی اصلاح کا جذبہ تھا، بالکل صحیح ہے اور انھوں نے سرسید کی مذہبی خدمات پر بجا طور پر زور دیا ہے۔ سوانح عمری میں سب سے زیادہ ضروری چیز وہ ہمدردی ہے جس کے بغیر سوانح نگار ہیرو کی نفسیات کو اچھی طرح سمجھ نہیں سکتا۔ حالیؔ کے یہاں یہ چیز موجود ہے اور اسی وجہ سے ان کی کتاب کو مدلل مداحی یا کتاب المناقبت اور یک رخی تصویر کہا گیا۔ حالانکہ سوانح نگاری میں یہ سنگ راہ کا

---

۱ حالی حیات جاوید، دہلی ۱۹۹۰ء، ص ۳۷۷

۲ سید عبداللہ۔ مقدمہ حیات جاوید، لاہور، ۱۹۵۷ء، ص ۳۰

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

کام دیتی ہے۔[1]"

حالی سوانح نگاری کے مغربی اصولوں سے واقف تو معلوم ہوتے ہیں مگر انھوں نے مغربی اصولوں کو مناسب نقد و جرح کے بغیر صحیح اور درست تسلیم کر لیا ہے۔ جیسا کہ اس سے قبل بیان ہو چکا ہے کہ سوانح عمری میں کسی کو کچھ ثابت کرنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ سوانح عمری کو سراپا کچھ ہونے کا نام ہے۔ سرسید ایک سچے آدمی تھے۔ اس کا اعلان بالکل بجا اور درست ہے مگر حالی کی طرف سے سرسید کی سچائی کا یقین دلانا ایک ایسی بات ہے جس پر بجا طور پر اعتراض ہو سکتا ہے۔

حالی نے سرسید کے رفقاء کو سرسید کا بڑا مددگار لکھا ہے لیکن ضرورت ان کی سیرت کے مختلف پہلوؤں کو واضح کرنے کی تھی۔ مولوی عبدالحق اور شیخ اکرام دونوں نے ان کی بعض کمزوریوں کا ذکر کیا ہے اور یہ کمزوریاں قومی معاملات پر اثر انداز ہوئیں۔ ان کی بسا اوقات حد سے بڑھی ہوئی مصلحت بھی مضر ثابت ہوئی۔ اسی طرح وقار الملک کی سیرت کی خوبیوں اور خامیوں کا ذکر علی گڑھ تحریک کے خدوخال کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے۔ محسن الملک کے برعکس وقار الملک میں قدامت، وقار اور کھرا پن زیادہ تھا۔ ان کی بہت سی خصوصیات سرسید کے مماثل تھیں لیکن ذاتی جذبات پر قومی مفاد اور وقت کی ضرورت کو ترجیح دینے میں وہ سرسید سے پیچھے تھے۔ غرض کتاب میں سرسید کے رفقائے کار کا سلسلہ بھی مناسب طریقے سے قائم نہیں رہا اور نہ کسی کا درجہ واضح طور پر متعین ہو سکا ہے۔

سرسید کے معترضین کا ذکر بھی شاذ و نادر ہی کیا گیا ہے۔ تمام اختلافات مذہبی کو بھی جگہ نہیں دی گئی ہے۔ تمدنی اور سیاسی اعتبار سے جو لوگ سرسید کی مخالفت کرتے تھے اس کا کیا سبب تھا؟ مولانا حالی نے ان اختلافات کو بھی زیادہ اہمیت نہیں دی ہے مگر ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ مصنف نے معمولی اختلافات کو جگہ دی ہے اور اس طرح تناسب قائم نہیں رکھا ہے۔ مثلاً پنجاب کا اخبار 'رفیق ہند' جو سرسید کا پہلے موافق تھا اور پھر مخالف ہو گیا تھا۔ اس طرح بعض دوسرے معمولی اخباروں کی مخالفت کا ذکر

---

[1] آل احمد سرور۔ نقش حالی حصہ دوم لکھنؤ، ص ۲۱۔۴۲۰

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

کر کے معمولی باتوں کو اہم اور بعض سنجیدہ مخالفتوں کو معمولی بنا دیا جس کی وجہ سے تحریک سرسید کے بعض کمزور پہلو پوری طرح واضح نہ ہو سکے۔ ایک سوانح نگار کی حیثیت سے ان تمام پہلوؤں کا جو سرسید کی لائف سے متعلق تھے یا ہو سکتے تھے، جائزہ لینا ضروری تھا اور انھیں دلچسپ انداز میں پیش کرنا ان کے فرائض میں داخل تھا۔ پھر ان تحریروں کو جو سرسید کی مخالفت میں شائع ہوئی تھیں یا خطوط کی شکل میں خود سرسید تک پہونچی تھیں، ان کے بعض ضروری اقتباسات کتاب میں درج ہونے چاہیے تھے تاکہ قوم اپنی ذہنی کیفیت کو خود اپنے آئینے میں دیکھ سکتی۔

آخر میں حالی کے اسلوب بیان پر جو حیات جاوید جیسی ضخیم کتاب میں ابھر کر سامنے آیا ہے، اظہار خیال ضروری سمجھتا ہوں۔ حیات جاوید کے اسلوب میں متانت ہے، پختگی ہے اور استدلال کا پہلو حاوی ہے۔ فقرے سادہ لیکن طویل، بیان منطقانہ، مدلل اور تحریر سے صداقت، خلوص، ہمدردی اور یکسانیت ظاہر ہوتی ہے۔ باوجود سادگی کے اس میں وہ دلکشی نہیں ہے جو ایک سوانح کو ناول کی طرح پر لطف بنا دے۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ انھوں نے اپنے عام اسلوب کو ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔

حالی کے متعلق یہ رائے ظاہر کی گئی ہے کہ وہ اسلوب بیان میں سرسید احمد خاں کے مقلد تھے۔ یہ صحیح ہے کہ ان کا اسلوب بیان بعض صورتوں میں سرسید کے اسلوب بیان سے یقیناً مماثلت رکھتا ہے مگر ان کے طرز نگارش کی چند باتیں ایسی ہیں جو سرسید کے بیان میں ہرگز موجود نہیں۔ سید عبداللہ نے سرسید کے اسلوب کی اُن تین خصوصیات کا ذکر کیا ہے جو حالی کے اسلوب میں ملتی ہیں اور وہ ہیں سادگی، منطقیت اور بے تکلف اظہار[1]

اس کتاب میں الفاظ کی تکرار بھی دیکھنے میں آتی ہے۔ عبارت کی روانی اور سلاست کی راہ میں یہ تکرار روڑا بن جاتی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ حالی نے انگریزی الفاظ کا کثرت سے استعمال کیا ہے۔ جہاں تک زبان کی وسعت کا سوال ہے اس میں حالی حق بجانب تھے کیوں کہ دنیا کی ہر زبان دوسری زبانوں سے الفاظ لیتی ہے اور اس طرح اپنے دائرۂ الفاظ کو وسیع کرتی ہے لیکن یہ ضرورت اس وقت پیش آتی ہے جب

---

[1] سید عبداللہ۔ سید احمد حالی اور ان کے نامور رفقاء، علی گڑھ، ۱۹۸۸ء، ص ۱۲۰

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

اس زبان میں اس کے متبادل الفاظ نہ ہوں۔ حالی نے اس کے برعکس وہ الفاظ بھی استعمال کئے ہیں جن کے لیے اردو میں الفاظ موجود ہیں۔ مثلاً پولیٹیکل، آرگن، ہسٹری، فیلنی، اسٹیٹ، پریسڈنٹ، ریڈرس، ڈیپوٹیشن وغیرہ۔ اردو کے قارئین کے لیے یقیناً یہ الفاظ غیر مانوس ہو سکتے ہیں۔

سید عبداللہ حالی کے اسلوب بیان میں جوش بیان کی کمی کو بڑے جوش کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ ان کے یہ الفاظ بہترین ادبی چاشنی سے معمور ہیں:

> ''ان کی تحریوں میں جوش بیان کی خاص کمی ہے۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ وہ جذبات سے معرّی ہیں کیونکہ ان کی غزل اور ان کی مسدس نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ وہ احساس اور جذبے کی ان دولتوں سے مالا مال ہیں جو ایک شاعر کو ودیعت ہوتی ہیں۔ اس کے باوجود ان کی نثر کو پڑھ کر بعض اوقات یہ محسوس ہوتا ہے کہ ان کا قلب زندگی کی سب حالتوں میں ''یک رنگ'' سا رہتا ہے۔ ان کے یہاں جزر ہی جزر ہے مد نہیں۔ ان کی دنیا میں گرمیوں کی دوپہر کبھی نہیں آتی۔ ان کے نظام زندگی میں نہ گہری تاریکی ہے نہ چندھیا دینے والی روشنی۔ مدھم روشنی اور مل گجا اندھیرا ہے۔ ان کے یہاں نہ قہقہے ہیں نہ فریادیں۔ ایک دردمند آدمی کا میٹھا میٹھا تبسم ہے اور بس۔ غرض زندگی کی شدید حالتوں کا احساس تو ہوتا ہوگا مگر اس کا اظہار نہیں ہوتا۔[1]''

مختصراً یہ کہ فقرے سادہ مگر طویل ہیں، بیان منطقانہ اور مدلل ہے، تحریر سے صداقت، خلوص، ہمدردی اور یک رنگی ظاہر ہو رہی ہے۔ ہر ہر پیراگراف میں حالی کی شخصیت جھلک رہی ہے۔ تفصیل اور جامعیت کے لیے مصنف بے قرار نظر آتا ہے۔ ان کے ہر پیراگراف میں معلومات کے ذخیرے ہوتے ہیں۔ ان کی عبارتوں میں پرسکون روانی ہوتی ہے۔ دماغ کو ان کے پڑھنے سے بہت سکون ملتا ہے۔ خیال کی دنیا ہلچل کم پیدا کرتی ہے۔

---

[1] سید عبداللہ۔ مقدمہ حیات جاوید، لاہور، ۱۹۵۷ء، ص ۳۶۔۳۵

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

بحیثیت مجموعی حیات جاوید اپنی خامیوں کے باوجود موجودہ فن سوانح نگاری کے لحاظ سے اردو کی ایک بہترین سوانح عمری ہے۔ سرسید اور ان کے عہد کے مطالعے کے سلسلے میں کوئی شخص اس کتاب سے بے نیاز نہیں رہ سکتا۔ اب رہا یہ سوال کہ حیات جاوید کو وہ شہرت و مقبولیت کیوں نہ حاصل ہوئی جو اس کے ہیرو اور مصنف دونوں کے شایان شان ہے۔ اس کا جواب دیتے ہوئے شیخ چاند لکھتے ہیں:

''بات یہ ہے کہ سرسید کو ہم نے قرب زمانی کی وجہ سے نہایت بے دردی سے بھلا دیا ہے اور نہایت ناشکری کے ساتھ اس کے انقلاب انگیز احسانات پر پردہ ڈال دیا ہے۔ اب رہا مصنف کے کارنامے کی طرف سے تغافل تو اس میں ایک حد تک خود تصنیف کا بھی قصور ہے۔ یہ اس قدر ضخیم کتاب ہے کہ کسی کو اس کے مطالعے کی ہمت نہیں ہوتی۔ ایک اور سبب اس کی طرف سے بدگمانی کا ہے۔ اس کی نسبت یہ مشہور ہے کہ اس میں سرسید کی تصویر کا ایک رخ دکھایا گیا ہے۔ اس سے مدعا یہ ہے کہ حالی نے صرف سرسید کے مناقب و محاسن بیان کیے ہیں اور معاقب و نقائص پر پردہ ڈال دیا ہے۔ یہ گویا حالی کو فنی نقص کا الزام دینا ہے۔ اس الزام کی تاریخ تاریکی میں نہیں بہت آسانی سے معلوم ہو سکتی ہے[1]''

★★

---

[1] شیخ چاند۔ یادحالی، مرتب: سید محی الدین، نئی دہلی، ص ۴۳

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

باب چہارم

خلاصہ

سوانح نگاری اردو ادب میں وہ صنف نثر ہے جس میں کسی ایک متعین شخص یا اشخاص کی زندگیوں کے حالات پیدائش سے لے کر موت تک بیان کئے جاتے ہیں اور جن کے کارناموں پر روشنی بھی ڈالی جاتی ہے۔ جدید اصولوں کے مطابق سوانح حقائق پر مبنی ہوتی ہے اور حقائق سے الگ ہٹ کر اس میں تخیلات کی گنجائش نہیں ہوتی ہے۔ اس میں ادبیت اور حسن ترتیب و حسن انتخاب کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ عموماً بڑی شخصیتوں کو ہی سوانح کا موضوع بنایا جاتا ہے اور سوانح لکھنے کا ایک بڑا مقصد بھی ہوتا ہے اور وہ یہ کہ اس کے مطالعے کے ذریعے بڑے انسانوں کی زندگیوں کے نشیب و فراز سے سبق حاصل کیا جائے اور اسی کی روشنی میں اپنی زندگیوں کو قابل عمل بنایا جائے۔ سوانح نگاری میں شخصیت یا ہیرو کے انھیں گوشوں کو پیش کیا جاتا ہے جن سے اس کو سمجھنے میں مدد مل سکتی ہو۔

اُردو سوانح نگاری نے انگریزی سوانح نگاری سے بہت استفادہ کیا ہے۔ باسول جو انگریزی کا سب سے بڑا سوانح نگار مانا جاتا ہے، جانسن کی سوانح لکھ کر اس نے فن سوانح میں ایک نیا انداز پیدا کیا۔ اس میں بیان کردہ ہر واقعہ خود بولتا ہے کیونکہ باسول نے ذاتی تاثرات سے احتراز کیا ہے۔ اس کے برخلاف اردو سوانح عمریوں میں جگہ جگہ مصنف کے ذاتی تاثرات نے فن سوانح کو کافی مجروح کیا ہے۔

سوانح نگار کا ہیرو اس کا معاصر بھی ہوسکتا ہے اور غیر معاصر بھی۔ معاصر ہونے کی صورت میں سوانح نگار براہ راست ہیرو سے اپنے ذاتی ربط، ہم عصر لوگوں کے تاثرات اور ہیرو کے ذہنی و سماجی پس منظر کو پیش نظر رکھتے ہوئے مواد کو یکجا کرسکتا ہے۔ ایسی صورت میں سوانح لکھنے والا سخت امتحان سے گزرتا ہے کیونکہ واقعات و حادثات

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

کے انبار سے اسے ضروری اور متعلقہ چیزوں کو ہی پیش کرنا ہوتا ہے۔ اگر ہیرو سوانح نگار کا ہم عصر نہیں ہے تو اس کو تاریخ، وقائع، خطوط، یادداشتوں، روزنامچوں، ڈائریوں اور اس عہد کے دوسرے افراد کی سوانحوں سے بھی معلومات حاصل کرنی ہوتی ہیں۔ یہاں ضرورت کے لحاظ سے اپنے منطقی استدلال، تخئیل یا قیاس سے بھی مدد لے سکتا ہے۔ مواد کی فراہمی کے دوسرے ذرائع میں خود ہیرو کے گفتار و کردار، خطوط، اقوال و اعمال اور لطائف و ظرائف سے بھی مدد لی جاتی ہے نیز دوسری کتب اور اردو اخبار و رسائل کا سہارا بھی لیا جاتا ہے۔ سوانح کے مواد میں ہیرو کی خودنوشت کو زیادہ اہمیت حاصل ہوتی ہے۔

سوانح نگار کا کام یہ ہے کہ وہ موضوع کی ہو بہو تصویر پیش کردے، ہر واقعے کو غیر جانبداری سے دیکھے اور اصولاً کسی بھی خوبی یا خرابی سے صرف نظر نہ کرے۔ یہ صحیح ہے کہ سوانح نگار کو ہیرو سے ہمدردی اور انسیت ہونی چاہیے لیکن صرف اسی حد تک کہ سچائی اور صاف گوئی پر دھبہ نہ پڑے۔ سوانح میں ہیرو کی معمولی جزئیات بھی اس کی سیرت پر اثر ڈال سکتی ہیں اس لیے انہیں نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔

سوانح محض تاریخ نہیں کیونکہ اس میں تاریخ سے مدد لی جاتی ہے۔ سوانح میں تاریخ، فرد واحد اور ادبی چاشنی کی آمیزش ہوتی ہے۔ تاریخ میں حقائق کا بیان خشک انداز سے ہوتا ہے اور اس میں اجتماعی زندگیوں کا بیان ہوتا ہے جبکہ سوانح میں شخصی رشتے کی کارفرمائی ہوتی ہے۔

سوانح نگار کی شخصیت ہیرو کی شخصیت سے کچھ کم اہمیت نہیں رکھتی کیونکہ اسی پر سوانح کی کامیابی کا دارومدار ہوتا ہے۔ ایمرسن کے مطابق ایک عظیم آدمی کی ضرورت ہے تاکہ ایک عظیم تر آدمی کی تشریح کر سکے۔ گرچہ فن سوانح نگاری کا یہ ایک تقاضا ہے لیکن اسے ضروری قرار نہیں دیا جا سکتا کیونکہ ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں جو اس شرط کو پوری نہیں کرتیں پھر بھی اچھے معیار پر پہونچتی ہیں۔ مثلاً باسول کی حیات جانسن جو دنیا کی بہترین سوانح عمریوں میں سے ایک ہے۔

سوانح نگار کو چاہیے کہ وہ محض خارجی افعال کی وقائع نگاری کے بجائے شخصیت کی اندرونی فطرت و نفسیات کو سامنے لانے کی کوشش کرے۔ اسے ہیرو کے

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

افعال اور اس کی اصلیت و حقیقت کے درمیان رشتے کو بھی واضح کرنا چاہیے۔ لیکن اس عمل میں سے کسی طرح کی جذباتیت کا شکار نہیں ہونا چاہیے۔ عقیدت و احترام میں ایسا ہو سکتا ہے کہ ہیرو کی یک رخی تصویر جھلک اٹھے لہٰذا سوانح نگار کو اپنے موضوع کے ساتھ انصاف کرنے کی پوری کوشش کرنی چاہیے۔

ادب میں طرز ادا اور اسلوب کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ سوانح نگاری میں اسلوب ایک امتیازی خصوصیت ہے۔ مواد کی فراہمی کے بعد اس کو سلیقے سے پیش کرنا ہی اصل فن کاری ہے۔ اس میں نہ تو تاریخی خشکی کی ضرورت ہے اور نہ ہی ناول و ڈرامے کی طرح تخیلاتی و حسیاتی رنگ کی۔ اس کے بجائے حقائق کا بیان سادگی، تازگی اور شگفتگی کے ساتھ کرنا چاہیے۔ اسٹریچی سوانح میں ادبیت کو فوقیت دیتا ہے۔

خودنوشت سوانح عمری اور سوانح عمری میں فرق یہ ہے کہ خودنوشت میں مصنف اپنے حالات خود قلم بند کرتا ہے جب کہ سوانح عمری کسی شخص کی کسی دیگر قلم کار کے ذریعے مرتب کی جاتی ہے۔ گرچہ دونوں کے اصول و ضوابط یکساں ہیں لیکن انداز مختلف ہوتا ہے۔ خودنوشت میں مصنف بعض واقعات کو پوشیدہ بھی رکھ سکتا ہے اور اس کا قلم جذباتیت سے پر بھی ہو سکتا ہے لیکن سوانح نگار ان چیزوں سے احتراز کرتا ہے۔ خودنوشت میں خود پرستی کا اندیشہ ہوتا ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ خودنوشت میں مصنف اپنے حالات کو بلا کم و کاست پیش کر کے باطنی اسرار و رموز سے بھی واقف کرائے۔

اردو سوانح نگاری کے آغاز کا گہرا رشتہ عربی اور فارسی سوانح نگاری سے ملتا ہے۔ عربی میں عہد اسلام میں بے شمار ایسی تصانیف لکھی گئیں جن کے ذریعے مذہبی ضرورت کے پیش نظر راویوں کے کردار کی جانچ پرکھ ہوتی تھی۔ علاوہ بریں مسلم جنگجوؤں، خلفاء اور فاتحین کی سیرت پر کتابیں لکھی گئیں۔ عربی سوانح نگاری اس لحاظ سے قابل ذکر ہے کہ اس میں اعلیٰ سوانح عمری کے بہترین عناصر پائے جاتے ہیں۔ دراصل مصنفین حالات کے سلسلے میں نقد و تبصرہ یا جرح کرتے وقت حقائق اور سچائی کی پاسداری کا خاص خیال رکھتے تھے۔ وہ نجی جزئیات کو بھی بیان کر دیتے تھے۔ خصوصاً سیرت رسول پیش کرنے کا انداز لائق تحسین ہے۔ لیکن حالات کی زد میں سوانح نگاری کا یہ بہترین

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

اور مبنی بر حقیقت انداز جاتا رہا اور اس کی جگہ بے جا مدح وستائش نے لے لی۔ عربی میں تذکرے بھی لکھے گئے جن میں سوانح کے اجزاء منتشر ہوتے ہیں۔ مسلم حکمرانوں نے فارسی زبان پر اپنا اثر قائم کیا تو سوانح نگاری بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہی۔ فارسی میں بھی تذکرہ نگاری کی بنیاد پڑی۔ مگر ان میں شعراء کے کلام کا انتخاب زیادہ اور ان کے حالات بہت کم ملتے ہیں۔ بعض میں تاریخی ترتیب، بعض میں تخلص کے لحاظ سے ترتیب کے ساتھ اور بعض میں جغرافیائی ترتیب کے ساتھ شعراء کے حالات کا بیان ملتا ہے۔ تذکروں کی اہمیت اس لحاظ سے مسلّم ہے کہ سوانح کے ارتقاء میں یہ بے حد معاون ثابت ہوئے۔ تذکروں کے علاوہ فارسی میں مشاہیر سلف کی سوانح عمریاں بھی لکھی گئیں نیز ہندوستان کے مسلم فاتحوں اور فرماں رواؤں سے متعلق کتابیں منظر عام پر آئیں مثلاً توزک تیموری، توزک بابری، ہمایوں نامہ اور توزک جہانگیری۔ انہیں صنف سوانح کے ذیل میں اس لیے نہیں رکھا جا سکتا کیونکہ ان میں یادداشت، روزنامچوں اور آپ بیتی کے مختلف عناصر بیک وقت پائے جاتے ہیں۔

سب سے پہلے دکن میں اردو کی نیم سوانح عمریاں منظوم لکھی گئیں۔ نثر کی دیر پا ترقی کی وجہ سے اس وقت نثری سوانحی تصنیفات نہیں لکھی جا سکیں۔ غرض سترھویں صدی عیسوی میں اردو زبان نے شخصیت نگاری اور سوانح نگاری کے مختلف بکھرے عناصر کو مثنویوں اور دیگر منظوم صورتوں میں پیوست کیا۔ اس سلسلے میں نصرتیؔ کی مثنوی ''علی نامہ'' اور وجہیؔ کی ''قطب مشتری'' قابل ذکر ہیں۔ شمالی ہند میں بھی اس دور میں مرثیہ نگاری ملتی ہے جس میں غیر شعوری طور پر سوانح کے خط وخال مل جاتے ہیں۔ پھر اُردو میں تذکرہ نگاری کی بنیاد پڑتی ہے۔ اردو تذکروں کا سارا انداز فارسی پر منحصر رہا ہے۔ فارسی ہی کے طرز پر اردو شعراء کے تذکرے بھی لکھے گئے۔ ان تذکروں میں قیمتی سوانحی مواد تو ضرور ملتا ہے لیکن انھیں سوانح عمری کا نعم البدل نہیں قرار دیا جا سکتا کیونکہ ان میں حالات وواقعات کی تفصیل کے بجائے مدح وذم کا پہلو زیادہ غالب ہوتا ہے۔ دوسرے یہ کہ تذکرہ نگاری کے ذریعے تذکرہ نگاروں کو اپنی فصاحت وبلاغت اور انشاء پردازی کا جوہر دکھانے کا زیادہ موقعہ ملتا تھا۔ اس کا مقصد سیرت نگاری نہیں

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

تھا۔ اس سلسلے میں نہ تو کسی طرح کے اصول وضوابط تھے اور نہ ہی شعراء کے انتخاب کے لیے شرائط تھے۔ بلکہ ہر تذکرہ نگار اپنی ذاتی پسند و ناپسند کے لحاظ سے اپنی قابلیت کے جوہر دکھاتا تھا۔ اس کے باوجود ان تذکروں کی اہمیت یہ ہے کہ ان کے ذریعے ہمیں متعلقہ عہد کی تہذیب و تمدن، اقتدار، معاشرت، ماحول کے مشاہدات، سماجی، سیاسی اور معاشی حالات کا پتا چلتا ہے۔ ان کی وجہ سے اردو زبان کے سرمایے میں بھی اضافہ ہوا اور اسے توانائی مل گئی۔ ظاہر ہے سوانح نگاری کے ارتقاء میں ان تذکروں کو کبھی بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

تذکروں کے علاوہ دیگر ایسی تصانیف بھی پائی جاتی ہیں جن میں بالواسطہ سوانح کے نقوش ملتے ہیں۔ ان میں زیادہ تر مذہبی رنگ غالب تھا۔ اس کے بعد اردو میں جدید سوانح نگاری کا دور شروع ہوتا ہے جو مغربی انداز پر اپنی بنیاد رکھتا ہے۔ اس دور میں حالی اور شبلی دو اہم اور باقاعدہ سوانح نگار ابھرتے ہیں۔ ان دونوں میں حالی کو بہر حال شبلی پر فوقیت حاصل ہے کیونکہ انھوں نے فن سوانح نگاری کے جدید اصولوں کو اپنی سوانح عمریوں میں برتنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ شبلی کی کتابوں میں تاریخ و سوانح دونوں کی آمیزش ہوتی ہے۔ عہد حالی میں سرسید اور عبدالحلیم شرر کے نام اس طور پر اہم ہیں کہ ان کی بعض تصنیفات سے سوانحی اجزاء جڑے ہوئے ہیں۔

حالی نے روایت کے مطابق بچپن میں عربی و فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ انھیں تعلیم سے بے حد لگاؤ تھا۔ ان میں فطرتاً شاعری کا ملکہ ودیعت کیا گیا تھا جس کو ان کے استاد غالب نے بھی سراہا۔ حالی نے قدیم شاعری پر جو تصنعات اور غیر ضروری چیزوں کا پلندہ تھی، سخت تنقید کی اور سیدھی سچی باتوں کو اشعار میں ڈھالنے پر زور دیا۔ لاہور میں بحیثیت ملازم وہ انگریزی ادب کے اردو تراجم سے واقف ہوئے اور مغربی لٹریچر سے ان کی دلچسپی بڑھنے لگی۔ سرسید احمد خان سے ملاقات کے بعد حالی ان کی شخصیت اور ان کے بلند مقصد سے بے حد متاثر ہوئے۔ حالی صحیح معنوں میں فرشتہ صفت انسان تھے۔ وہ حق پرست، حق گو، صاف دل اور منکسر و خاکسار انسان تھے۔ سرسید کی طرح انھوں نے مسلمانوں کو ان کی پستی، ذلت اور پسماندگی سے نکالنے کی بھرپور تدابیر

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

کیں۔ وہ قوم کے حد درجہ خیر خواہ تھے۔ وہ افادی اور مقصدی ادب کے قائل تھے اسی لیے انھوں نے اپنی کاوشوں کو قومی و ملی فلاح کے لیے وقف کر دیا۔

حالی کی ''حیات سعدی'' (۱۸۸۶ء) اردو میں پہلی باقاعدہ سوانح عمری خیال کی جاتی ہے جو طرز جدید کی سائنٹیفک بایوگرافی ہونے کا شرف رکھتی ہے۔ سعدی کے ساتھ حالی کی ذہنی مماثلت نے اس کتاب کو بہتر بنانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ ان کی دوسری سوانح عمری ''یادگار غالب'' (۱۸۹۷ء) ہے جسے غالب کے مطالعے کے سلسلے میں بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ ''حیات جاوید'' (۱۹۰۱ء) سرسید کی شخصیت اور ان کے کارناموں کو پیش کرنے والی حالی کے قلم سے نکلی ہوئی ایک بہترین سوانح عمری ہے۔ سرسید ایک مختلف النوع اور اختلافی شخص تھے لہٰذا ان کی زندگی کو پیش کرنا دریا کو کوزے میں سمیٹنے کے مصداق تھا۔ پھر بھی حالی نے فن سوانح کے اصول وضوابط کی روشنی میں اس کو ترتیب دیا۔ گرچہ اس کتاب پر متعدد اعتراضات کیے گئے ہیں اس کے باوجود اسے آج تک اردو کی ایک بہترین سوانح عمری قرار دیا جاتا ہے۔ حالی کے بقول انھوں نے اس میں نکتہ چینی کی بنیاد ڈالی ہے جب کہ اپنی پہلی دونوں سوانح عمریوں میں زمانے کا لحاظ کرتے ہوئے خامیوں پر انگلی اٹھانے سے پرہیز کیا ہے۔

حیات جاوید سے قبل اور سرسید کی وفات سے تیرہ برس قبل ایک انگریز کرنل گریہم نے سرسید کی لائف کو مرتب کر کے اسے شائع کر دیا تھا۔ حالی کے دوست مشی سراج الدین نے بھی اس کے لیے مواد جمع کر کے ایک حد تک اسے مرتب کر دیا تھا۔ حالی نے ان دونوں مواد سے فائدہ اٹھایا۔ اس کے علاوہ انھوں نے سرسید کے معاصر ہونے کی حیثیت سے دوسرے ذرائع سے بھی مواد یکجا کیا۔ ترتیب و انتخاب کے وقت انھیں بڑی مشکل پیش آئی۔ اس کے باوجود انھوں نے بخیر و خوبی اپنے کام کو انجام دیا۔

''حیات جاوید'' دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصے میں سرسید کی زندگی کے واقعات اور ان کے تمام کام ترتیب وار بقید تاریخ بیان کئے گئے ہیں۔ اس حصے کو چھ ابواب میں بانٹا گیا ہے۔ کتاب کا دوسرا حصہ سرسید کی ترقی کے اسباب کے جائزے پر مشتمل ہے۔ اس میں ابواب کے بجائے عنوانات قائم کئے گئے ہیں۔ یہ حصہ مصنف کی علمی لیاقت

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

اور کمال محنت کا مکاس ہے۔ سرسید کے کارناموں کو حالی نے بڑی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا۔ چنانچہ انھوں نے سرسید کے بے مثال کارناموں کو حسن بیان کے ساتھ پیش کیا۔ ایسا کرتے ہوئے حالی نے صداقت و دیانت کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ انھوں نے دل کھول کر سرسید کی عظمت کی داد دی ہے لیکن واقعات کو جوں کا توں پیش کیا ہے۔ وہ سرسید کے عقیدت مند اور قدر دان تھے اور ان کی تحریروں میں بھی حمایت کا جذبہ جھلکتا ہے۔ فن سوانح کے لحاظ سے سوانح نگار کو موضوع سے عقیدت رکھنی چاہیے لیکن لکھتے وقت حمایت کا پہلو غالب نہیں آنا چاہیے۔ باسول کی ''حیات جانسن'' اس کی عمدہ مثال پیش کرتی ہے۔ بلاشبہ حالی بھی ایک حقیقی سوانح نگار کی تمام صفات سے متصف تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ حالی کی اس کتاب پر جتنے زیادہ اعتراضات ہوئے ہیں اتنی ہی اس کی اہمیت نکھر کر ہمارے سامنے آگئی ہے۔ کسی کتاب کی عظمت کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ لوگوں کی توجہ کا مرکز بنے۔ اختلافات بجائے خود علمی کام کی طرف نشان دہی کرتے ہیں اور فی الحقیقت معیوب نہیں سمجھے جاتے مگر مخالفت اور دشمنی میں کسی پر نکتہ چینی کرنا اور چن چن کر کیڑے نکالنا معیوب ہے۔

حالی نے کتاب کے پہلے حصے میں سرسید کے ذہنی ارتقا کو تفصیل سے نہیں واضح کیا ہے۔ انھوں نے کہیں کسی بڑے واقعے کو اختصار سے بیان کر کے فنی کمزوری کا ثبوت دیا ہے اور کہیں معمولی لیکن حقیقتاً اہم واقعات کو تفصیل سے بیان کر کے فنی پختگی کا ثبوت پیش کیا ہے۔ پھر بھی انھوں نے شخصیت کے تاثر کو ہر جگہ قائم رکھا ہے۔ حالی کے مطابق سرسید کے بچپن کی زندگی دوسرے بڑے انسانوں کی طرح عظمت کی طرف اشارہ نہیں کرتی ہے بلکہ وہ عام انسانوں جیسی ہی تھی۔

''حیات جاوید'' کے سب سے بڑے معترض شبلی نے اسے ''مدلل مداحی''، ''کتاب المناقب'' اور سرسید کی یک رخی تصویر بتایا ہے۔ شبلی کی نکتہ چینی کا یہ سخت انداز صرف اس کتاب کے لیے خود انھیں کی جانب داری کی طرف دلالت کرتا ہے۔ شبلی کی تصنیف کردہ سوانحی کتابیں المامون، سیرت النعمان، الفاروق اور الغزالی تصویر کے دوسرے رخ کی کمی کی غماز ہیں۔ پھر سرسید کی کمزوریوں کو بے نقاب کرنے کے لیے شبلی

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

اس قدر مصر کیوں تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ حالی نے سرسید کی خوبیوں کو ابھار کر دکھایا ہے اور خامیوں کو اچھالا نہیں ہے پھر بھی انھوں نے تنقیدی نظر سے کام لیا ہے اور سرسید کے عقیدت منداور مداح ہوتے ہوئے بھی ان کی خامیوں کو بیان کیا ہے۔ حالی بھی ایک انسان تھے لہٰذا غلطی کا سرزد ہونا ایک فطری بات ہے۔ ان کی پوری زندگی دیانت داری، انصاف پسندی اور صداقت جیسے اہم ستونوں پر قائم تھی لہٰذا یہ بیان کہ عمداً انھوں نے ایسا کیا ہے قرین قیاس معلوم نہیں ہوتا۔

شبلی کے دوست حبیب الرحمان خان شیروانی اور دیگر نقادوں نے بھی حیات جاوید پر متعدد اعتراضات کیے بعد دیگرے وارد کئے ہیں لیکن انھوں نے جوش تنقید میں اس ماحول اور مخصوص فضا کو فراموش کر دیا ہے۔ حالی کے پیش نظر ایک بڑا مقصد تھا۔ وہ ایک بڑے انسان کی سیرت کو پیش کر کے قوم کی اصلاح کے خواہاں تھے۔ اسی لیے انھوں نے کتاب میں نتائج سے زیادہ بحث کی ہے۔ بشریت کو بے نقاب کرنا نہ ان کے مقاصد میں تھا اور نہ انھوں نے اس کی کوشش کی۔ جن امور میں سرسید کی ذات بدگمانیوں اور غلط فہمیوں کی محل بنی ہوئی تھی حالی نے ان کا تفصیلی جائزہ لیتے ہوئے اپنا نقطۂ نظر پیش کیا ہے۔ یہ بات تعجب خیز نہیں ہونی چاہیے کہ حالی نے اپنے محبوب کی نظری و عملی کوتاہیوں کو بیان کر کے مصلحت آمیز بات کی ہے اور تاویلات بھی کی ہیں۔ یہ ایک فطری عمل ہے جسے اپنی محبوب شخصیت کے لیے ہر انسان سہواً کر بیٹھتا ہے۔

''حیات جاوید'' کا اسلوب منطقانہ، مدلل اور پختہ ہے۔ فقرے سادہ مگر طویل اور تحریر صداقت، خلوص، ہمدردی اور یکسانیت سے مملو ہے۔ حالی کے یہاں بے تکلف اظہار ملتا ہے جو زبان پر ان کی گرفت کو ثابت کرتا ہے۔ الفاظ کی تکرار بھی دیکھنے میں آتی ہے لیکن موضوع کی نوعیت کو دیکھتے ہوئے اس سے احتراز ممکن نہ تھا۔ حالی نے انگریزی الفاظ کا بھی جابجا استعمال کیا ہے۔ مختصراً یہ کہ کلی طور پر حالی بحیثیت سوانح نگار کامیاب ہیں۔ گرچہ حیات جاوید ایک ضخیم کتاب ہے لیکن سرسید کی زندگی اور کارناموں کے مطالعے کے لیے اسے اولیت حاصل ہے۔ حالی نے اس سوانح کو ترتیب دے کر بعد کے سوانح نگاروں کو فن سوانح کو برتنے کا ہنر سکھا دیا جس کی تقلید آج بھی جاری ہے۔

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

کتابیات

۱۔ الطاف حسین حالی، حیات جاوید، ترقی اُردو بیورو، نئی دہلی، ۱۹۹۰ء

۲۔ الطاف حسین حالی، حیات جاوید، اکادمی پنجاب (ٹرسٹ)
لاہور، طبع جدید، مقدمہ از سید عبداللہ، ۱۹۵۷ء

۳۔ الطاف حسین حالی، مقالات حالی، انجمن ترقی اُردو ہند، علی گڑھ، ۱۹۶۶ء

۴۔ الطاف حسین حالی، مضامین حالی، مرتبہ منشی عبدالرحمان شوق امرتسری، لاہور

۵۔ الطاف حسین حالی، یادگار غالب (مرتب مالک رام) مکتبہ جامعہ، نئی دہلی لمیٹڈ

۶۔ الطاف حسین حالی، حیات سعدی، (مرتب مالک رام) مکتبہ جامعہ، نئی دہلی لمیٹڈ، ۱۹۹۲ء

۷۔ امیر اللہ خاں شاہین، فن سوانح نگاری اور دیگر مضامین، طاہر بک ایجنسی، دہلی، ۱۹۷۳ء

۸۔ امیر اللہ خاں شاہین، اُردو اسالیب نثر تاریخ و تجزیہ، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی

۹۔ انوار الحسن، مولانا حالی، لکھنؤ ادارہ فروغ اُردو، ۱۹۵۷ء

۱۰۔ جمیل جالبی، تاریخ ادب اُردو جلد اوّل (آغاز سے ۱۷۵۰ء تک)
ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۷۷ء

۱۱۔ حنیف نقوی، شعرائے اُردو کے تذکرے (نکات الشعراء سے گلشن بے خار تک)
نسیم بک ڈپو، لکھنؤ، ۱۹۷۶ء

۱۲۔ خورشید الاسلام، تنقیدیں، انجمن ترقی اُردو ہند، علی گڑھ، ۱۹۵۷ء

۱۳۔ خلیق احمد نظامی، سرسید اور علی گڑھ تحریک۔ ایجوکیشنل، پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۸۲ء

۱۴۔ خان عبید اللہ خان، مقالات یوم شبلی، اُردو مرکز، لاہور، ۱۹۶۱ء

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

۱۵۔ زبیر محمد امین، تذکرہ شمس العلما، خواجہ حالی مرحوم، اناوہ اسلامیہ ہائی اسکول، ۱۹۲۵ء

۱۶۔ سید حامد حسین، نثر اور انداز نثر، نسیم بک ڈپو لکھنؤ، ۱۹۸۴ء

۱۷۔ سید عبداللہ، میر امن سے عبدالحق تک، چمن بک ڈپو، دہلی، ۱۹۶۰ء

۱۸۔ سید عبداللہ، سرسید احمد خان اور ان کے نامور رفقاء کی اردو نثر کا فنی اور فکری جائزہ ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۸۸ء

۱۹۔ سید احتشام حسین، تنقیدی جائزے، ادارہ فروغ اردو لکھنؤ، ۱۹۰۶ء

۲۰۔ سید شاہ علی، اردو میں سوانح نگاری، گلڈ پبلشنگ ہاؤس، کراچی، لاہور، ڈھاکہ، ۱۹۶۱ء

۲۱۔ سید محی الدین (مرتب)، یادِ حالی، یعنی وہ مضامین جو جشن صد سالہ یادگار پیدائش شمس العلماء خواجہ الطاف حسین حالی کے موقع پر عثمانیہ کالج اورنگ آباد میں پڑھے گئے، جامعہ پریس، دہلی

۲۲۔ سید عابد حسین، مضامین عابد، کتابی دنیا لمیٹڈ، دہلی، ۱۹۴۷ء

۲۳۔ سفارش حسین رضوی (مولف)، انتخاب حالیؔ، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، ۱۹۸۳ء

۲۴۔ شارب ردولوی، جدید اردو تنقید اصول و نظریات، اتر پردیش، اردو اکادمی، ۱۹۹۴ء

۲۵۔ شجاعت خورشید الاسلام، تنقیدیں، انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ، اکتوبر ۱۹۵۷ء

۲۶۔ صالحہ عابد حسین، یادگار حالیؔ، انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ، ۱۹۵۵ء

۲۷۔ صالحہ عابد حسین، حالیؔ، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، ۱۹۸۳ء

۲۸۔ ضیاء الدین لاہوری، خود نوشت حیات سرسید، جنگ پبلیشرز، لاہور، پاکستان، ۱۹۹۳ء

۲۹۔ طیبہ خاتون، اردو میں ادبی نثر کی تاریخ (۱۸۵۷ء تا ۱۹۱۴ء) مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، ۱۹۸۹ء

۳۰۔ ظہیر احمد صدیقی بدایونی، تحقیقی مطالعۂ حالی، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ

۳۱۔ ظفر ادیب، دو حالی، قصد اردو بازار، دہلی، ۱۹۷۴ء

۳۲۔ عبدالقیوم، حالیؔ کی اردو نثر نگاری، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۶۴ء

۳۳۔ فرمان فتح پوری، اردو نثر کا فنی ارتقا، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۹۷ء

۳۴۔ قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی، سرسید کا علمی کارنامہ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، کراچی، ۱۹۶۴ء

۳۵۔ کشمیری لال ذاکر، ناشر نقوی (مرتبین) حالی اور سرزمین حالی۔ ہریانہ اردو اکیڈمی، ہریانہ ۱۹۹۲ء

۳۶۔ مہدی افادی، افادات مہدی، دیباچہ مولانا عبدالماجد، ۱۹۲۳ء

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

۳۷۔ مولانا وحید الدین سلیم، افادات سلیم، مرتب خلیق انجم، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی، ۱۹۹۴ء۔
۳۸۔ ممتاز فاخرہ، اردو میں فن سوانح نگاری کا ارتقا (۱۹۱۴ء تا ۱۹۷۵ء)
رونق پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۸۴ء۔
۳۹۔ محمد حبیب الرحمان خان شیروانی، مقالات شیروانی، مرتب و طابع محمد مقتدی خان شیروانی، ۱۹۴۶ء۔
۴۰۔ مولوی عبدالحق، چند ہم عصر، انجمن ترقی اردو، پاکستان کراچی، ۱۹۵۳ء۔
۴۱۔ مشیر احمد علوی ناظر کاکوروی، علی گڑھ تحریک اور ادب اردو، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ، ۱۹۹۹ء۔
۴۲۔ نورالحسن ہاشمی، احتشام حسین رضوی۔ شجاعت سندیلوی (مرتبین) نقش حالی حصہ دوم، سرفراز قومی پریس لکھنؤ
۴۳۔ وہاج الدین علوی، اردو خودنوشت فن و تجزیہ، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی، ۱۹۸۹ء۔

رسائل

۱۔ جمناتٹ سہ ماہی مجلہ، حالی اور سرزمین حالی نمبر، جولائی تا دسمبر ۱۹۸۹ء
ادارۂ تحریر کشمیری لال ذاکر، ناشر نقوی ہریانہ اردو اکیڈمی
۲۔ فکر و نظر سہ ماہی حالی نمبر، اکتوبر ۱۹۹۱ء علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
۳۔ اردو سہ ماہی، اپریل ۱۹۵۲ء حالی نمبر۔ انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی
۴۔ فروغ اردو حالی نمبر حصہ دوم لکھنؤ، جون ۱۹۵۹ء۔
مرتبین نورالحسن ہاشمی، سید احتشام حسین رضوی، شجاعت علی سندیلوی
۵۔ نقوش ادبی معرکے نمبر، ستمبر ۱۹۸۱ء۔ ادارۂ فروغ اردو، لاہور۔
۶۔ فکر و نظر۔ شبلی نمبر، جون ۱۹۸۶ء علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

★★

Scanned by CamScanner

www.urduchannel.in

HALI KI SAWANEH NIGARI

HAYAT-E-JAVED KI ROSHNI MEIN

MALIK RASHID FAISAL

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE
3108, VAKIL STREET, KUCHA PANDIT, LAL KUAN, DELHI-6 (INDIA)
PH: 23216162, 23214465 FAX: 011-23211540
E-MAIL: ephdelhi@yahoo.com

Scanned by CamScanner